مارچ - اپریل ۱۹۴۴ء

ارم

لکھنے والے

جناب - جی ایم - خان، ایم - اے - بی - ایس - سی - اے - ایم - آئی - سی (اڈنبرا)

" خورشید احمد جامی

" ابو الفدا محمد عبد القادر

" علی اشرف ایڈیٹر تنظیم

" ڈاکٹر حمید الدین صدیقی

" نواب سیف علیخان جاگیردار

" عبد القادر فاروقی

" سید نیاز حیدر ناکام

" معین الدین خان انور طاہر

سردار الہام (عثمانیہ)

اور

دوسرے

ادارت

مدیرہ! شکیلہ۔ جی۔ یم۔ خان

مددگار۔ ارشاد محمد خان آزاد بی۔ ایس۔ سی اعلیگ،

ناظم۔ سید راشد حجازی

سالانہ چندہ چار روپیہ

ششماہی دو روپیہ آٹھ آنے

صدر دفتر۔ سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد دکن

شاخ ۔۔ روبرو نامپلی ہائی اسکول نامپلی روڈ ۔

جلد ۴ | ماہ مارچ و اپریل ۱۹۴۴ء م اردی بہشت و خورداد ۱۳۵۳ف | **شمارہ ۸ و ۹**

فروری کے پرچہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اپریل کا پرچہ "ترقی نمبر" ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے نمبر کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی تھیں۔ مضامین نگار حضرات سے وعدے لئے گئے تھے۔ کہ مضامین دو ہفتے کے اندر ہمیں پہنچ جائیں۔ چونکہ اشتہارات کے بغیر زیادہ صفحات کا پرچہ نکالنا اس گرانی کے دور میں خودکشی کے مترادف ہے لہذا مشتہر صاحب سے بھی پختہ وعدہ لے لیا گیا مگر ان سنجیدہ انتظامات کے باوجود اپریل اپریل ہی رہا۔ مشتہر اور مضمون نگار دونوں نے ہم سے اپریل کو قطعی طور پر اپریل خیال ہی نہیں کرتے ہوئے بلکہ اس پر ایمان لاتے ہوئے وعدہ کیا۔

مطلب یہ کہ اپریل کے نام پر جس قدر چاہو جھوٹ بولو جھوٹے وعدے کرو۔ جھوٹی خبریں اڑاؤ۔ سب جائز ہے۔ یقین کیجئے اس جمہوری مذاق کو مذاقِ سلیم تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم کو سخت کوفت ہوئی۔ خدا کرے کہ اپریل میں جرمن کی ڈینگیں اور جاپان کی نشری بیہودگیوں کو سب ہندوستانی مکمل طور پر اپریل کا مذاق تصور کریں تو ممکن ہے۔ ہمارے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔

آئندہ پرچہ "ترقی نمبر" ہوگا۔

سید راشد حجازی

حکومت الٰہیہ

ابوالفدا محمد عبدالقادر

جب سے کہ مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا ہے ۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ حکومت الٰہیہ کے اصلی خدوخال کیا ہیں ۔ صدر مسلم لیگ کے اس صاف اور سادہ بیان کے باوجود کہ پاکستان کے حصول سے پیشتر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان کا نظام حکومت کیا ہوگا ۔ پھر بھی ہندوستان میں دن بدن یہ سوال اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ کس حکومت کو کہتے ہیں ؟ اس کا نظام کیا نوعیت رکھتا ہے ۔ ایک طرف تو خوش عقیدگی کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے اس باب کو بھی اسلامی و الٰہی حکومت کہا جا رہا ہے جس کو بجا طور پر ملوکیت اور بادشاہت کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ اور اس شاہانہ و ملوکانہ نظام سے بھی نظائر پیش کئے جا رہے ہیں عقل و بصیرت حیران ہے کہ کسے کیا کہئے ؟ تو دوسری طرف یہ حال ہے کہ نام نہاد آزاد خیالی کا نام لیکر اس نظام حکومت کو ایسا نظریہ کہا جا رہا ہے کہ جو شرمندۂ معنے نہ ہوا اور تحقیق کا نام لیکر یہ ثابت کرنیکی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ اولی الامر کے پردے میں شاہی اختیارات کا تحفظ اور خلیفۃ اللہ کی آڑ میں شہنشاہی خود مختاری کی سپر ہے ۔ اس لئے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اشتراکیت کے دلخوش پروگرام کیطرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے ۔ اس ذہنی غلامی کو کیا کیا جائے سچ کہا تھا ۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہ

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

یہ بھی ایک رجعت ہے کہ انسان دوسروں کی فکر و ذہن کا غلام بنا رہا ہے انہی کی عینک سے ہر مسئلہ کو دیکھے ۔ دوسروں کے دل و دماغ سے سوچے سمجھے ۔ اور پھر بزعم خود یہ خیال کرے کہ ہم سوچ رہے ہیں ۔ ہم تحقیق کر رہے ہیں ۔ حالانکہ وہ تو اس چیز کو سمجھ رہا اور اختیار کر رہا ہے کہ جو دوسروں نے اس کے لئے سوچا تھا ۔ یہ فکر و ذہن کی آزادی نہیں ۔ غلامی ہے جو مادی غلامی سے کہیں زیادہ بری اور خطرناک ہے ۔ جو ہمارے ذہن و فکر کی عملی توانائیوں کو مفلوج کرنے کا باعث ہوگی ۔ ضرورت تو اس کی متقاضی ہے کہ ہم خالی الذہن ہو کر وسعت قلبی اور ذہنی آزادی کیساتھ حکومت الٰہیہ کے اصل ماخذ پر پاکبازی اور دیانت داری سے غور کریں ۔ نظریہ حکومت الٰہیہ کا اصل ماخذ قرآن کریم ہے جس کی تشریح حدیث شریف ہے اور یہی وہ بنیادیں ہیں جس پر حکومت الٰہیہ قائم ہو سکتی ہے ۔

قرآن کریم انسانی آزادی کا علمبردار ہے وہ انسان کو انسان کا غلام بنانا نہیں چاہتا ۔ اس نے فرعون و قارون اور اسی قبیل کے لوگوں کا بار بار ذکر کر کے انہیں طاغی اور زمین میں فساد پھیلانے والے کہا ۔ اس نے ملوکیت کو خواہ وہ جمہوریت کا نقاب ہی کیوں نہ اوڑھے انسانیت پر ظلم قرار دیا وہ غلامی سے آزاد کرانے کو اسلام کا بلند ترین مقصد قرار دیتا ہے ۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شخصی حکومت میں ایک فرد کی خواہش پر تمام افراد مملکت کی جائز تمنائیں

بھینٹ چڑھادی جاتی ہیں۔ جمہوریت جو آزادی کی دعویدار ہے۔ اس کے نظام حکومت میں بھی مملکت کی اکثریت حکمراں اور اقلیت محکوم ہوتی ہے۔ اور آج یہی جمہوریت اپنے محکوم ممالک کے غربا کو فاقوں اور غلامی کی حالت میں مار رہی ہے اشتراکی نظام کی حکومت میں مزدور طبقہ ہی کی حکمرانی ہوتی ہے اور دیگر طبقات غلام ہوتے ہیں۔ اسٹالن نے اپنی کتاب "لنن ازم" میں صاف تصریح کردی کہ وہ عہد حاضر کی اشتراکیت سے مراد مزدور کی جماعت کے ڈکٹیٹر مقرر کرنے کا نظریہ اور اس نظریہ کی عملی ہیئت کذائی ہے" مارکس اپنے منشور اشتراکیت میں لکھتا ہے کہ "ملکی پیداوار کے ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کردئے جائیں"۔ یہ تو اشتراکیت نہوئی زار وقیصر کی حکومت ہوئی ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

قرآنی نقطۂ نظر سے اقتدار کا سرچشمہ نہ فرد ہے اور نہ کوئی جماعت و طبقہ بلکہ الٰہی مملکت میں اقتدار اعلیٰ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں۔ جو ازلی ابدی اور واجب بالذات ہے وہی کائنات کا حکمران ہے۔ اسی کے آگے فطرت انسانی اپنی جبین نیاز جھکا سکتی ہے۔ اس سے بڑھکر فکر و عمل انسانی کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ علامہ اقبال مرحوم نے "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ "اسلام بحیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانیکا عملی طریقہ ہے اس کا مطالبہ وفاداری خدا کیلئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے۔ اور چونکہ ذات باری کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے" اس تخیل بلند کو بعض کوتاہ فہم نراجیت کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم ہم کو نراج کیطرف لیجانا نہیں چاہتا۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی فطرت اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے۔ معاشرہ قائم رہ سکتا ہے اور نہ ترقی کر سکتا ہے جب تک کہ عدل و انصاف کو نافذ کرنے والا کوئی نہ ہو۔ دین کی تمکین اور انسانوں کے ذہنی اور اخلاقی قویٰ کی نشو نما کے لئے مملکت کی ضرورت ہے قرآن کریم نے حکومت الٰہیہ کے قیام اور قوانین الٰہیہ کے نفاذ کے لئے عوام کو ایک شخصیت کے انتخاب کا حق دیا جس کو قرآنی اصطلاح میں خلیفہ یعنی ذات باریتعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا نائب کہا جاتا ہے قرآنی نقطۂ نظر سے نوع انسانی کا ہر فرد بالقوہ خلیفہ ہے لیکن انسان اکثر ایسے ہیں جو قدرتی مواقع سے اپنی غفلت کی وجہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے ان کی استعدادیں وہ کمال حاصل نہیں کر سکتیں کہ بالفعل یا عملی حیثیت سے خلیفہ ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انتظامی حد تک ایک ایسی شخصیت کے انتخاب کا حکم دیا جسمیں خلافت کی عملی اہلیت و قابلیت ہو جس کا کام قوانین الٰہیہ کا نفاذ اور حکومت الٰہیہ کا قیام

نہ کہ اپنی مرضی منوانا اور نہ عوام کی غلط خواہشات کی پابندی کرنا ۔ چونکہ اسلامی مملکت کا ہر فرد خلیفہ ہے ۔ اور انتظامی حد تک ایک شخصیت کا انتخاب گویا تمام افراد مملکت کی خلافت کا ایک شخصیت میں مرتکز ہوتا ہے ۔ اس لئے خلیفہ کے حقوق متعین ہیں اس کی حیثیت صرف عامل یا عامل کی ہوتی ہے جس کا کام قرآنی احکامات نافذ کرکے حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے زیادہ سے زیادہ یہ حق دیا کہ ان احکامات کی باہمی مشورے سے تاویل کرے ۔ اگر خلیفہ اور افراد مملکت میں کوئی اختلاف ہو تو اس کو قرآن کریم اور احادیث کی روشنی میں طے کیا جائے ۔ اگر خلیفہ غلطی کرے تو افراد مملکت کو حق ہے کہ اسے متنبہ کریں اگر افراد غلطی کریں تو خلیفہ کو حق ہے کہ انہیں آگاہ کرے اور صحیح راستے پر لگائے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا ہر کام مشورہ پر رکھا گیا ہے انفرادی آزادی اور آزادی ضمیر کا احترام کیا گیا ہے ۔ اس مملکت میں انسان اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے ذریعہ ہی قوانین الٰہی کی توجہ کا مجاز ہے ۔ حکومت الٰہیہ شخصی حکومت نہیں اور نہ جمہوری ہے شخصی حکومت میں افراد مملکت ایک شخص کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں مگر اسلامی خلافت کا اصول یہ ہے کہ خلیفہ کی خواہشات کی پابندی نہیں کی جاتی ۔ بلکہ قوانین الٰہیہ کی ۔ اگر خلیفہ ان قوانین کے خلاف کرے تو افراد مملکت کو قرآن کریم حق دیتا ہے کہ اسے قوانین الٰہیہ کا پابند بنائیں ۔ جمہوری حکومت عوام کی خواہشات کی پابندی ہوتی ہے ان کے خلاف نہیں کر سکتی خواہ وہ غلط راستے پر چلیں ۔ اس کے نزدیک حق وہ مشیت عامہ ہے ۔ کیونکہ جمہوری نظام میں اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں ۔ مگر قرآن کریم نے جس طرح افراد کو یہ حق دیا کہ وہ حکومت کی نگرانی کریں ۔ اس طرح خلیفہ کو یہ حق ہے کہ افراد کو قوانین الٰہیہ کا پابند بنائے بصورت خلاف ورزی سزا دے ۔ اس طرح الٰہی حکومت میں افراد حکومت کے اور حکومت افراد کی نگرانی ہوتی ہے اس لئے اسلامی حکومت کی اطاعت غلامی نہیں بلکہ انسان کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہے ۔ خلیفہ کی اطاعت اس لئے نہیں کی جاتی کہ وہ قوت و جبروت کا مالک ہے بلکہ اس کی عزت و احترام اس لئے ہے کہ وہ فطری حقوق اور الٰہی قوانین کا پاسبان ہے ۔ اس طرح آدمی آدمی کا نہیں بلکہ فطری و الٰہی قوانین کا تابعدار ہو جاتا ہے ۔ جسکی وجہ اس کی انسانیت و شرافت کو بٹا نہیں لگتا ۔

الٰہی حکومت کا دستور اللہ تعالیٰ کیطرف سے نازل کیا ہوا ۔ ناقابل تغیر ۔ انمٹ ۔ تحریری ۔ اور عالمی و دائمی ہے اس لئے زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے ۔ یہ دستور تمام انسانوں کیلئے ہے ۔ جس کی پابندی سے ہر فرد فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ دیگر مملکتوں کے قوانین ان کی حکومتیں بناتی ہیں ۔ اور اس کا بہت کچھ انحصار برسر اقتدار جماعت کے مسلک پر ہوتا ہے ۔ یہ کام جماعت مقننہ کے سپرد ہوتا ہے اکثریت کے مفاد کو پیش نظر رکھکر یہ قوانین بنائے جاتے ہیں ۔ الٰہی قانون قرآن کریم ہے جس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کیلئے

قوانین موجود ہیں۔ یہ قوانین ہر زمانہ و مقام کے لئے قابل عمل ہیں۔ وہ فطری قوانین ہیں جن کو ہر جماعت اپنے مزاج و احوال کے مطابق برت سکتی ہے۔ چونکہ یہ عالمی حکومت ہے جس کے قیام کی مدت نامعلوم ہے۔ اس لئے اس کے قوانین زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہیں کوئی برسراقتدار جماعت اس میں تغیر و تبدل کر کے اپنے مفید مطلب قوانین نہیں بنا سکتی یہ قانون صرف فروعی حد تک لچک دار ہے یہ اجازت ہے کہ بتائے ہوئے اساسی اصول کے تحت حالات و واقعات دیکھکر ان کی تاویل کریں یہ فروعی قوانین ہوسکتے ہیں جن کا بنیادی اصولوں پر قائم ہونا ضروری ہے۔ قرآن کریم نے قوانین کی توجیہ و تاویل کے لئے شوریٰ کی شرط لگائی ہے جس میں متقی عاقل بالغ ہوں۔
جب اقتدار کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے تو اس سے انسانی ضمیر کی آزادی کا اصول بھی مسلم رہتا ہے۔ اور جماعت کی ترقی کے راستے بھی مسدود نہیں ہوتے۔
فکر انسانی معطل و منجمد بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ انسان اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے ذریعہ ہی قانون الٰہیہ کی توجیہ کا مجاز ہے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کہ کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کیا کروگے انہوں نے کہا قرآن کریم سے آپ نے کہا اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے انہوں نے کہا جو سنت رسول اللہ میں ہو۔ آپ نے فرمایا اگر سنت رسول میں بھی نہ ہو تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا اس پر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر ہے کہ جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے" (ابوداؤد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اس جواب پر کہ "میں اپنی رائے قائم کرنیکی کوشش کرونگا" اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اور اظہار خوشنودی فرمانا۔ صاف طور پر پتہ دیتا ہے کہ آپ نے قوانین سلطنت الٰہیہ کو ایک منجمد اور مخصوص چیز بنانا نہیں چاہا بلکہ ان قوانین کو استقرائی رکھنا چاہا ہے۔ تاکہ انسان کے قوائے دماغیہ کی نشوونما اور انسانی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوسکے۔
قرآن کریم نے مملکت کے ہر ادارہ کیلئے کافی و اکمل تعلیم دی ہے۔ معاہدات۔ جنگ۔ معاشرت۔ معاشیات وغیرہ کے اصولوں کے متعلق کامل تعلیم ہے۔ ہر شعبہ و ادارہ مستقل مضمون کا حامل ہے جس میں چند مختصراً اصول بیان کئے گئے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اچھی حکومت جس کی انسانیت متلاشی ہے اور جس کے بغیر انسانیت چین کی زندگی نہیں گذار سکتی وہ "حکومت الٰہیہ" ہے۔

اب کیا کروں

افسانہ

شیخ امیرالدین (عثمانیہ)

موٹروں کے نمبر نوٹ کرنے کی ہمیں کچھ عادت
سی ہوگئی ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ہمیں کچھ بیماری سی ہوگئی
ہے۔ جہاں بھی ہمیں کوئی ایسی موٹر دکھائی دیتی ہے
جس میں کوئی مس صاحبہ بیٹھی دعوت نظارہ دے رہی
ہوں تو بس ہم نے فوراً اپنی نوٹ بک نکالی اور اس
کا نمبر نوٹ کرلیا۔ بعد میں اپنے دوستوں سے کہہ دیا
کہ دیکھو یار موٹر نمبر ۔۔۔ کا ضرور خیال رکھو۔ اس
میں اچھی اچھی مس صاحباں سیر کیا کرتی اور ہمیں دعوت
نظارہ دیتی ہیں۔ بس پھر کیا پوچھئے۔ دو چار دن میں
مکمل رپورٹ تیار ہو جاتی ہے۔ گاڑی کے مالک فلاں
صاحب ہیں۔ اور یہ کہ فلاں صاحبہ اس میں پھرا کرتی
ہے۔ فلاں وقت فلاں جگہ اور فلاں وقت فلاں جگہ
جایا کرتی ہیں۔ ان کے گھر کا فون نمبر ۔۔۔ ہے۔ ذات
سے مس صاحبہ شریف ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض
مکمل رپورٹ تیار ہو جاتی ہے تاکہ اگر آئندہ کوئی موقع پڑے
تو اس رپورٹ سے کام لیا جائے۔ اس طرح سے
کئی گاڑیوں کے نمبر اور مکمل رپورٹ اس وقت بھی
ہماری نوٹ بک میں لکھے ہوئے ہیں۔ تو بھئی یہ تو ہماری
عادت ہے۔ اگر کسی کو برا معلوم ہوتا ہو تو ہم معافی چاہتے
ہیں۔ نظر اپنی اپنی، پسند اپنی اپنی۔ اسی طرح سے عادت
اپنی اپنی۔ ہماری یہ عادت ایک عرصہ پہلے تھی۔ اب بھی
ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی ضرور رہے گی۔

تو خیر۔ گذشتہ سال کا ذکر ہے کہ ابھی ہم اپنے امتحانات
سے فارغ ہی نہیں ہوئے تھے کہ سلکٹ ٹاکیز میں شاردا فلم
شروع ہوا۔ ڈائرکٹر کاردار کے اس فلم کو دیکھنے کی ہمیں
بڑی خواہش تھی مگر وقت کہاں سے لاتے۔ بی ایس سی
کا آخری سال تھا۔ اسلئے ہم تو ہر چیز کو خیرباد کہکر صرف پڑھنے
میں مصروف ہوگئے تھے۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمارے
دوستوں کا کہ انہوں نے طے کر ہی لیا کہ دوشنبہ کی شام
ضرور "شاردا" دیکھیں گے!! بھلا ان کے فیصلے کو کون
ٹال سکتا ہے۔ ہم نے بھی ہاں کہہ دی دوشنبہ کو ۵ ہی
بجے ہم ہاسٹل سے روانہ ہوئے اور چلے سیدھے افضل گنج
راستے میں خوب گپ ہانکتے رہے۔ قریب ۶ بجے کے
ہم سلکٹ ٹاکیز میں داخل ہوگئے تھے۔ ہمارے پہلے ہی
لوگوں کا ایک اژدھام ٹکٹ لینے کھڑا ہوا تھا۔ ہم بھی
کھڑے ہوگئے۔ درجہ دوم میں جب دال گلتی نظر نہ آئی
تو ہم نے درجہ اول کو ہی غنیمت جانا اور ٹکٹ لے ہال
میں داخل ہوگئے۔ ۶½ بجے کھیل شروع ہوا کھیل
انتہائی دلچسپ تھا۔ درمیان میں خوب ہنستے رہے کھیل
جب ختم ہوا ہے تو ہم کو افسوس ہوا کہ یار اور اگر فلم لامبا
ہوتا تو اچھا ہی تھا۔ خیر باہر چلے آئے۔ بعضوں نے سوچا
کہ چلو گئے ہاتھوں دوسرا شو بھی دیکھ ڈالیں۔ آرزو نکل

جائے گی مگر ہم نے صاف کہدیا کہ ہم کو تو پڑھنا ہے۔ ہم تو چلے۔ ہماری اس گفتگو میں کافی وقت گزر چکا تھا جانے والے تقریباً سب جا چکے تھے۔ ہم بھی چلے۔ باہر گیٹ پر اندھیرا تھا۔ بلیک اوٹ سے فائدہ اٹھا کر ہم نے گانا شروع کر دیا "میرے من کو سجن سمجھاؤ"۔ گیٹ سے باہر ہوئے ہی تھے کہ ایک بڑھیا قسم کی موٹر اندر سے برآمد ہوئی۔ ڈرائیور نے ہارن اس وقت بجایا جس وقت موٹر کا مڈگارڈ ہماری شیروانی سے چھو چکا تھا۔ خدا کا شکر ہوا کہ ہم بچ گئے۔ غصہ تو بہت آیا مگر کیا کرتے گاڑی فرفر کرتی ہوئی یہ جا وہ جا نگاہ نمبر پلیٹ کی طرف پڑی ۴۴۴۱۔ غیر ارادی طور پر ہمارا ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ نوٹ بک نکلی اور ہم نے اسکا نمبر نوٹ کر لیا۔ دل میں ہم نے سوچ لیا کہ "اچھا دیکھا جائے گا"

صبح ناشتہ پر ہم نے اپنے دوستوں کو رات کی روداد یاد دلائی اور کہا کہ بھائی معلوم کرنا چاہتے۔ ۴۴۴۱ نمبر کی موٹر کس کی ہے۔ لیکن کوئی راضی ہوتا ہی نہیں تھا۔ سب کو یہ عذر تھا کہ امتحان قریب ہے خیر صاحب ہم نے دو ایک دوستوں کو مار کوٹ کر راضی کر ہی لیا۔ اور یہ لوگ اس مہم پہ روانہ کر دئے گئے۔

بھلا کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ ہمارے دوست جائیں اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو؟ تیسرے ہی دن ہمارے سامنے مکمل رپورٹ موجود تھی۔ "گاڑی نمبر ۴۴۴۱ کے مالک ہیں۔ نواب رشید انور بیگ۔ اکثر راتوں میں ان کی صاحبزادی صاحبہ خود موٹر چلایا کرتی ہیں ان کا فون نمبر ۴۷۴۴ ہے"۔ رپورٹ کو دیکھکر ہمیں خوشی تو ضرور ہوئی مگر یہ معلوم کر کے کہ صاحبزادی صاحبہ خود موٹر چلایا کرتی ہیں۔ کچھ شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ اس لئے کہ دوشنبہ کی شام ہم ایک لڑکی کی موٹر کے نیچے آتے آتے بچ گئے۔ ہم اور ایک لڑکی کی موٹر کے نیچے۔ زمانہ کی اس حالت پہ بہت افسوس کر کے خاموش ہو رہے بہرحال ہم نے بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ چاہئے وہ لڑکی ہو لڑکا یا کوئی اور ہم نے انہیں دوستوں سے پھر کہدیا کہ ان کی حرکات سکنات پر نگاہ رکھیں۔ اگر وہ سینما وغیرہ جائیں تو فوراً فون سے ہمیں اطلاع دیں

ہماری خوش قسمتی اور شاید مس صاحبہ کی بدقسمتی کہ وہ چوتھے ہی روز ہمیر شارد آ دیکھنے تشریف لائیں۔ جاسوسوں نے ہمیں اطلاع کر دی کہ ہم بلد چلے آئیں۔ ہم فوراً ہاسٹل سے نکلے۔ گھر پہنچے اور وہاں سے کار لیکر سیدھے چلے سلکٹ ٹاکیز۔ سینما ختم ہونے پر مس حمنا اپنی عادت کے بموجب مجمع چھٹ جانے کے بعد باہر نکلیں۔ وہ اسی گیٹ سے نکل رہی تھیں جس سے کہ ان کو نکلنا چاہئیے تھا۔ لیکن ہم نے غلط راستہ سے موٹر بڑھا دی نتیجتہً دونوں گاڑیاں آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں کمال یہ کہ دونوں میں سے ایک بھی پیچھے ہٹانا نہیں چاہتا اور دونوں ہارن بجا رہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد میں اترا اور اپنے مڈگارڈ پہ جا بیٹھا مس حمنا

بھی اتریں اور رکوکتے ہوئے میرے سامنے آ دھمکیں

وہ آپ گاڑی ہٹ تیجئے ۔"

میں معاف فرمائیے ۔ فیل ہوگئی ہے"۔

کیا مطلب"

وہی مطلب ۔ یعنی کہ گاڑی نے اب چلنے سے صاف انکار کردیا ہے ۔"

" وجہ"

"وجہ خدا خوب جانتا ہے ۔

" آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں"

" اجی توبہ کیجئے میں مذاق کیوں کرنے چلا"

" پھر یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ گاڑی راستہ سے ہٹاتے ہی نہیں ۔ اچھی بھلی گاڑی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ گاڑی خراب ہے ۔"

آپ نے کیسے جانا کہ گاڑی اچھی ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں" ایسی نئی گاڑی خراب ہی کیسے ہوسکتی ہے ۔ اور ابھی ابھی تو وہ چلتی آتی ہے"

" تو یوں سمجھئے کہ ہم نے آپ سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کیا تھا"

"آپ بہت بدمعاش معلوم ہوتے ہیں ۔"

" اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں ہے ۔"

" دیکھئے ۔ آپ شرافت سے راستہ صاف کردیں ورنہ"

"ورنہ کیا ہوگا ۔"

"پولیس سے مدد لینی ہوگی"

یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا پولیس والے خود جبری گاڑی پیچھے ڈھکیل دینگے ۔"

آخر آپ کیا چاہتے کیا ہیں ؟"

مس صاحبہ! میں آپ کو آپ کے حرکات کی سزا دینا چاہتا ہوں ۔"

"کیا مطلب!"

مطلب یہی کہ اگر آپ اسی طرح موٹر چلایا کریں گی تو بس دنیا میں نوجوانوں کا کال ہی پڑ جائے گا ۔"

"لیکن میں نے تو کبھی کوئی ا نہیں کیا ہے۔

جی ہاں ۔ آپ کیوں کرتے چلیں ۔ وہ تو خود بخود ہی ہو جایا کرتے ہیں ۔ پرسوں ہی شام آپ نے اس غریب پر سے موٹر چلادی تھیں ۔ وہ تو قسمت ٹھیک تھے ۔ ورنہ کام تمام ہی ہوگیا تھا ۔

اوہ ۔ تو وہ آپ ہی تھے ۔ میں نے خود اپنی ذاتی محسوس کی اس دن میں اپنی سہیلی سے باتوں میں مصروف تھی اس لئے لغزش ہوگئی ۔ مجھے سخت افسوس ہے ...... شاید اسی کا بدلہ لیتے آپ نے آج موٹر راستے میں کھڑا کردی ہے ۔"

" بڑی دیر میں سمجھتی ہیں آپ"

" اچھا تو اب ہٹا لیجئے ۔ آئندہ خیال رکھوں گی مجھے معاف فرمائیے"

"جب آپ اپنا نام وغیرہ بتادیں ۔"

"آپ میرے نام سے کیا کیجئے گا ۔"

"کچھ نہیں ۔ یوں کبھی کبھی ملاقات ہو جایا کرے گی ۔"

"اوہ - آپ بڑے ڈھیٹ معلوم ہوتے ہیں - غیر لڑکیوں کا نام پوچھتے آپ کو شرم آنی چاہیئے -

"مس صاحبہ شرم کی کونسی بات ہے - لیجئے میں اپنا نام اور پتہ بتا دیتا ہوں - مجھے جمیل کہتے ہیں - میرا فون ۱۷۸۱ ہے آپ جب چاہیں مجھ سے بات کر سکتی ہیں -"

"میں کیوں بات کروں آپ سے"

"یوں ہی اگر طبیعت نہ لگے تو"

میرا یہ جملہ سن کر وہ خفا سی ہو گئی - اور غصہ میں بھری ہوئی اپنی موٹر میں بیٹھ گئی - میں نے دل میں سوچا ایسا نہ ہو کہ یہ غصہ میں موٹر کو ٹکر لگا دے تو میں ڈیڈی کو کیا جواب دونگا - اس لئے شرافت سے گاڑی ہٹا لی - اور اس کو جانے کا راستہ دے دیا - جاتے ہوئے گاڑی جب میرے قریب سے گذری تو میں نے پوچھا - اجی جناب نام تو بتاتے جائیے - "فریدہ" اس نے کہا اور چلتی ہوئی یقیناً ہم نے میدان جیت لیا تھا - خوش خوش گھر پہنچے اور سو گئے -

خوشی میں نیند تو نہ آئی - صبح ہی اٹھے اور ہاسٹل پہنچے - رات کی روداد سب کو سنائی - مگر غضب ہی تو ہو گیا - دوستوں نے مٹھائی مانگنی شروع کر دی - کہنے لگے چلو تعارف تو ہو گیا آگے تعلقات بڑھ جائینگے - ان کو خیر جوں توں کر کے ٹالا مگر سیدھے ٹیلیفون روم میں داخل ہو کر اپنے آپ کو بند کر لیا - ڈائل کو گھمایا اور ہمارا ٹیلیفون فریدہ کے گھر سے مل گیا -

"ہلو" - کون صاحب ہیں" میں جمیل ہوں - دیکھئے فریدہ صاحبہ کون ہیں - ہاں میں ہی ہوں - فرمایئے کیا کہنا ہے" میں نے کہا - میں آپ سے رات کی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں - یہ لیجئے اور کتنی شرارت ارے کیا آپ مجسم شرارت ہیں - رات میں بدلے لیا نہ" "مجھے سخت افسوس ہے - رات میں غصہ میں جانے میں نے آپ کو کیا کچھ کہہ دیا مجھے سخت افسوس ہے" ارے نہیں نہیں - میں بہت خوش ہوئی - لڑکوں کی اس اسپرٹ کی میں داد دیتی ہوں - اچھا دیکھئے اگر آپ کو فرصت ہو تو شام کی چائے میرے ساتھ ہی پی لیجئے - اندھا کیا چاہے - دو آنکھیں -" بلا سوچے سمجھے ہم نے ہاں کر دی - دن بھر یوں ہی کر کے کاٹا - بہنے سے ہی ہمارا سنگار شروع ہو گیا - ہمارا بنگلور کا سلایا ہوا سوٹ زیب تن کیا اور شان سے اکڑتے ہوئے فریدہ کے گھر پہنچے - وہ میرے انتظار ہی میں تھی - پرتپاک طریقہ سے ہمارا استقبال ہوا اور ہم اندر چلے - اپنے والد سے بھی فریدہ نے تعارف کروایا اور ہم چائے پینے بیٹھ گئے - جھوٹ کیوں کہیں - چائے پینے کے بجائے ہم نے فریدہ کا جائزہ لینا شروع کیا - واقعی وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی - عادت اطوار چال ڈھال سب - ٹھیک ٹھیک دل ہی دل میں ہم نے اس کی خوب تعریف کر ڈالی - چونکہ اس وقت جب کہ فریدہ کی سہیلی نے کہا - جمیل صاحب کیا سینما نہیں چلیئے گا - ہم فوراً راضی ہو گئے -"

غرض ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی - بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ہم کو جمیل پکارا کرتی اور ہم اسے کہہ دیتے - دن بھر میں

ایک آدھ دفعہ ضرور ملاقات ہوجاتی خوب باتیں ہوتیں ہم نے اُس کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس نے ہمارا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ اب ہمارے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اے کاش میں فریدہ کو اپنی شریک حیات بنالوں۔ اور ہم ہنسی خوشی سے زندگی بسر کریں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فریدہ کا مطالعہ بحیثیت اپنی ہونے والی بیوی کے کرنا شروع کیا۔ ۲۰ ماہ کے غور و خوص کے بعد میں نے معلوم کیا کہ یوں تو فریدہ میں ہر چیز اچھی ہے مگر وہ سخت گیر بہت ہے۔ اپنا کہنا قسمت کا فیصلہ سمجھتی ہے۔ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ ضد پر تو اس سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا میں تھا ایک یار باش آدمی چوبیس گھنٹے دوستوں میں گھیرا رہنے والا بھلا فریدہ کو میری یہ عادت کیسے پسند آئیگی۔ لازماً مجھ پر پابندیاں عائد ہوجائیں گی۔ اور ظاہر ہے کہ میں اس کا روادار نہیں ہوں اس کا نتیجہ ضرور لڑائی ہوگی اور اگر ازدواجی زندگی میں لڑائی ہو تو پھر وہ زندگی زندگی باقی نہیں رہتی۔ غرض اس طرح کے لاکھوں خیالات میرے دل میں چکر لگانے لگے اور میں نے آخر کار طے کر لیا کہ فریدہ میری صرف دوست ہی رہے گی اپنی شریک حیات میں اسے نہیں بناؤں گا۔ ورنہ میری زندگی تلخ ہوجائے گی گھر دوزخ ہو جائے گا...... جانے کیوں اس خیال سے میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور پھر میں فریدہ سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگتا۔ مگر بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ ہم دونوں گہرے دوست تھے۔

خیر سے نتیجہ بھی نکلا اور ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ چند دنوں کے اندر ہی ہم نوکر بھی ہو گئے اب سب کو فکر تھی تو ہماری شادی کی بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے خود ہمیں بھی ہماری شادی کی فکر تھی۔ لیکن کہتے کس سے نظر دوڑاتے کہ کدھر ہاتھ ماریں۔ رہ رہ کر خیال جاتا فریدہ کیطرف مگر ساتھ ہی جسم میں ایک زلزلہ سا محسوس ہوتا اور دل زور سے پکار اٹھتا "نہیں وہ تو دوست ہی بھلے" ہم سے زیادہ ہمارے گھر والوں کو ہماری شادی کی فکر تھی۔ بلکہ دادی ماں نے دو ایک مرتبہ اماں جان سے کہہ بھی جا کر دیکھو بچہ دال روٹی سے لگ گیا ہے۔ جلدی شادی کردو ورنہ ٹھیک نہیں ہے۔ آخر کار ایک دن والدہ محترمہ نے ہم سے کہہ بھی دیا کہ جمیل دیکھو تمہاری شادی طے پاچکی ہے لڑکی دیکھی بھالی بہت اچھی ہے۔ خوبصورت ہے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔" اس خبر کو سنتے ہی ہمیں ایسا محسوس ہوا۔ گویا کہ ہم جنت میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ دل میں کہنے لگے کہ چلو فریدہ سے تو پیچھا چھوٹا۔ خدا نخواستہ اگر فریدہ مسز جمیل ہوجائیں تو بس جمیل میاں ہمیشہ گھر بند ہو جاتے۔ دوست احباب اور سارا اغل غپاڑا سب برخواست۔

بیرام پور ہمارے سسر صاحب کی جاگیر تھی اس لئے شادی وہیں مقرر ہوئی۔ ہم بھی ایک ہفتہ قبل وہاں پہنچ گئے۔ جاتے جاتے خیال کیا کہ چلو فریدہ کو بھی دعوت دیدیں کیا یاد کریگی۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ نہیں ہیں جاگیر کو گئے ہوئے ہیں۔ آٹھ دن تو شکار وغیرہ میں کٹ گئے۔ اب ہماری شادی آہی گئی۔ تمام گاؤں میں ایک دھوم تھی

ہر جگہ چراغ جلائے جا رہے تھے۔ گاؤں کا ہر گھر شادی خانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ جاگیردار صاحب کی لڑکی کی جو شادی تھی۔ مذاق تھوڑا ہی تھا۔

آخر وہ دن آیا۔ ہم دولہا بنے۔ عالیشان جلوس نکالا گیا۔ اور ہم بحیثیت دولہا میاں دولہن کے گھر پہنچے۔ سامنے دوستوں کا ہجوم تھا۔ اور پیچھے پیچھے ہم ہال میں داخل ہوئے۔ عقد ہوا۔ قاضی صاحب نے ہم سے ہاں کرالی اور دستخط بھی لے لی۔ ہم سب سے ملنے کیلئے اٹھے۔ دیکھا تو مہمانوں میں نواب رشید نواز جنگ صاحب بھی موجود تھے۔ ہم نے پرتپاک طریقہ سے ان سے بھی ملاقات کی وہ دعائیں دینے لگے "جیتے رہو۔ عمر دراز ہو۔ خدا تمکو ٹھیک راہ پر چلائے" ہمیں ان کی اس دعا پر تعجب سا ہونے لگا۔ خیر۔ گانا بڑے زوروں سے شروع ہو گیا دوست احباب کے اصرار پر ہم بھی چلے گئے۔ دن بھر خوب گانا بجانا ہوتا رہا۔ خوش گپیاں رہیں مبارکبادیوں سے ہم کو بدہضمی سی محسوس ہونے لگی۔ خیر سے خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ دھوم مچی کہ دولہا میاں اندر جلوے کو بلائے جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے آپکو ٹھیک ٹھاک کر لیا اور سیدھے چلے اندر ہم لیجائے جا کر تخت پر بٹھا دئے گئے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی ہونگے کہ پیچھے سے "اے جمیل" "اے جمیل" کی آواز آنے لگی۔ ہم چونک سے گئے اور پلٹ کر دیکھا پیچھے فریدہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہم نے کہا اندر تم کدھر۔ کہنے لگی "تم نے نہیں بلایا تو کیا ہوا۔ بھلا ہماری فریدہ بھی تم جیسی طوطا چشم تھوڑی ہے وہ ہمیں کیسے بھول جاتی" اتنا سننا ہی تھا کہ ایک دم ہمارا دل بیٹھ گیا۔ سانس رک گئی اور تارے نظر آنے لگے۔ ایک پل میں تمام واقعات نظروں کے سامنے آگئے

نواب صاحب کی دعا۔ دعوت دئیے جاتے پر فریدہ کا نہ ہونا۔ اندرا کا بعض اوقات خاموش خاموش مسکرانا دفعتاً سب یاد آگئے اور ہم نے ایک سرد آہ بھر دی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ خدا قسم اگر قاضی صاحب سیاہے میں فریدہ کا نام لکھتے تو ہم دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیتے۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ ہماری ہاں اور دستخط سب کچھ ہو چکی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ فریدہ کا دوسرا نام سکندر النساء ہے۔ خیر جلوہ ہوا۔ اور ہم نے فریدہ کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے پایا۔ ہارے کا سر مارے ہم فریدہ کو گھر لے آئے۔

آج شادی کو صرف ایک ہی مہینہ ہوا ہے اور مسز جمیل نے ہم پر سخت پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ دوستوں میں نہ بیٹھا کرو۔ باہر چائے زیادہ نہ منگوایا کرو۔ سینما زیادہ نہ دیکھو ہاسٹل میں کیا کام رہتا ہے کیوں جایا کرتے ہو۔ دفتر سے جلد واپس آیا کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ابھی سے ہماری یہ حالت ہے آئندہ خدا جانے کیا گت بنے اسلئے اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں

نوٹ:۔ یہ محض ایک افسانہ ہے کہیں میری ہونے والی شریک حیات یہ نہ سمجھے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ خدا قسم نہ تو شادی ہوئی ہے۔ اور نہ ہم کو موٹروں کے نمبر نوٹ کرنے کی عادت ہے

ہمارا مصلح

محمد عبدالقادر فاروقی

کہا جاتا ہے کہ زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا ہے شاعری کی تاریخ اور اقوام عالم کے مختلف زمانوں کی حالت اس صداقت کی کھلی دلیل ہے جب کسی قوم کی شجاعت اور جوانمردی کمال پر ہوتی ہے تو اس کے لیے میدان کار زار ایوان نشاط بن جاتا ہے۔ اس قوام کا شاعر نعرۂ جنگ بلند کرتا ہے۔ وہ گوہر افشاں نہیں بلکہ شرر ریز ہوتا ہے۔ اس کی شعلہ بیانی میں داستانِ شجاعت ٹھاٹھیں مارتی ہے اس قسم کے صدہا شاعر قدیم زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں دنیا جانتی ہے کہ اسپارٹا کی فتوحات کا سہرہ ایک نحیف الجثہ شاعر کے سر ہے جسے یونانیوں نے قومی خدمات کے ناقابل سمجھ رکھا تھا۔ عرب کے دورِ جاہلیت کے شاعر اعشیٰ کا ایک شعر جدال وقتال کی آتش افروزی کیلئے کافی سمجھا جاتا تھا۔

قوم کی زندگی میں ایک اور وقت آتا ہے جبکہ وہ حکمران ہوتی ہے۔ زعم حکمرانی اس کے قوائے حیات میں اضمحلال پیدا کر دیتا ہے۔ اور ذوق جد وجہد قناعت سے بدل جاتا ہے عیش طلبی کاہلی اور تن آسانی ان کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے حکمران سلاطین جو کبھی "شمشیر و سناں" کے مالک تھے مدھبرے ماحول اور رنگینی نے شراب و کباب و طاؤس و رباب کا رسیا بنا دیا جب حکمرانوں کی یہ حالت ہو تو قوم کا حال ظاہر ہے۔ ایسے دور میں شاعر آتش نوا نہیں بلکہ ارباب دولت و ثروت کی جبین سائی کرنے والا ہوتا ہے۔ جو قصائد اور غزل کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے حسن و عشق، خوشامد اور چاپلوسی سونے والوں کے لئے لوری بن جاتی ہے۔ اور شاعری میں تنزل اور ابتذال شروع ہو جاتا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کیساتھ اور بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری پر یاس و قنوطی کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں سوز و گداز افسردگی اور یاس کلام کی خوبی سمجھی جانے لگی بزم مشاعرہ ماتم کدہ بن گئی۔ قوم کی رگوں میں افسردگی اور غنودگی کا زہر برابر اپنا اثر کر رہا تھا۔ ہر طرف انحطاط اور زوال کے بادل منڈلا رہے تھے۔ مکالے نے سچ کہا ہے کہ دور انحطاط ہی میں شاعری چمکتی ہے اور ایسے میں خدا کا کوئی بندہ پیدا ہوتا ہے جو صدیوں کے نشہ کو چند "طعون" سے اتار دیتا ہے۔ سب سے پہلے حالیؔ نے نیند کے متوالوں کو کچوکے دئے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے۔ انکی شاعری میں نمک نہیں ہے۔ حالیؔ کے ہاں قومی احساسات کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ لیکن اقبالؔ نے اُسے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔

نغمہ و مئے و ساقی کے پُرانے ساغروں میں تند و تیز شراب ایک نئے انداز سے بھر کر پیش کی اور اتنی غیر معمولی قوتِ بیان سے کام لیکر سینوں میں دل اور دلوں میں امنگیں جوش اور ولولے پیدا کرنے والی حرارت کے نسخے تجویز کئے

یاس و حرمان کی برق کو قوم کے حوصلوں پر ٹوٹتی دیکھکر اقبال نے سب سے پہلے زندگی کی درخشندہ اور تابناک تصو

پیش کیا۔ ذوق عمل کے ساتھ ساتھ زندگی کے اصلی خط و خال پیش کئے۔ جو قوم کے مارگزیدہ تن کیلئے تریاق بن گئے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
کیوں گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری ہے تو۔
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفان بھی ہے۔

انہوں نے زندگی کی تفسیریں شروع کیں زندگی اور شاعری کو ایک دوسرے سے واسطہ کر دیا۔

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی۔
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں۔
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں۔

زندگی کی تفسیر ہی کوئی چیز نہ تھی اسکے ساتھ ساتھ متاعِ دنیا اور تسخیر نظام عالم کا درس بھی ضرور تھا۔ چونکہ ویدانتی فلسفہ کے اثرات نے دور تعطل کو بہ دے کر متاعِ دنیا حرام کر دیا تھا۔ اور اقبال اسی زہریلے مواد کو نکالنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے نشتروں سے فاسد مادہ میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ امید کے دیئے سے قنوطیت کے سیاہ خانوں کو منور کرنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔ وہ خود دیکھتے ہیں کہ جو ادب محض جمالیاتی ذوق کی تسکین کرے وہ ہماری زندگی کی قوت متحرکہ نہیں بن سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب دماغی کیف کیلئے ضروری ہے لیکن جو ادب محض دماغی تفریح کا سامان مہیا کرے۔ وہ ہمیں ذوق عمل اور ذوق تپش سے محروم کر دیتا ہے جو اصل روح حیات ہیں اقبال کے نزدیک آرٹ میں جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکے قلم کی ہر جنبش لطیف ترنم کے ساتھ ساتھ حیات نو کی داغ بیل ڈالنے لگی انہوں نے زندگی اور حرکت کی جمود اور تعطل پر مسلط کر کے کہہ دیا کہ عناصر عالم کے سامنے سر جھکا کر ہاتھ باندھ کر اطاعت کیلئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے پورا فائدہ اٹھا۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی۔
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار۔
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

غنچہ؟ از خود چمن تعمیر کن
شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

جب قوم کو اپنے جمود کا احساس ہوا۔ مردہ رگوں نے جھر جھری سی لی تو عاقل نباض نے فوراً تاڑ لیا کہ اس میں زندگی کی حرارت کو برقرار رکھنے کیلئے آرزوں کا ایک عالم پیدا کرنا ہوگا۔ جو اس کی قوت عمل کو برقرار رکھ سکے۔ چنانچہ للکار کر کہہ دیا۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا۔
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے۔

ریاضِ ملت خزاں آشنا ہو گیا تھا۔ سارے پتے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے تھے۔ بادِ سموم چل رہی تھی پھر بھی اقبال انتہائی جوش و ولولہ کیساتھ امیدوں کی بستی از سرِ نو تعمیر کرنیکی کوشش کرتا ہے۔

ہزاماں پیشِ نظر لَا تُخْلِفُ الْمِيعَاد دار

امید! امید! — امید و آرزو کا ایسا فلسفہ شائد (ہی) کسی کے ہاں ملے امید و آرزو کا جہاں تو بسا دیا مگر اب ان کے حصول کیلئے لازمی تھا کہ کوشش اور جدوجہد کرنے۔ مسلمان جو عیش و طرب کے رسیا ہوئے تھے اور یاس و حزن اُن کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ کسی قسم کی حرکت نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اقبال نے ایک اور تیز مہمیز لگائی۔ بتایا کہ زندگی مصائب و آلام سے ہاتھا پائی کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ سکون تو حیات کا دشمن ہے جس طرح موج میں پیچ و تاب ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی حرکت چاہئیے۔ سکون زندگی کے آثار نہیں پیدا کر سکتا اقبال نے قوم اور خصوصاً اس کے نوجوان کو زندگی کی حقیقی قدر سے واقف کرایا۔ اور حرکت کو اپنا نصب العین قرار دینے کا پیام دیا جس کی وجہ سے ان کی سرد رگوں میں احساس اور زندگی کی گرم لہریں دوڑ گئیں۔ تاروں کی زبان سے زندگی کا راز آشکار کر دیا۔

عیش سے ہے زندگی جہاں کی۔
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

چلنے والے نکل گئے ہیں۔
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں۔

اقبال مسلمان کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ایک سچا مسلمان کسی حالت میں بھی دنیوی طاقتوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ بے سر و سامان مٹھی بھر صحرا نشینوں نے بڑی بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر دیا۔

مٹا دیا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر فقر بوذر صدق سلمانی

اقبال انسان کو کائنات کی سب سے ارفع و اعلیٰ ہستی سمجھتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو اپنی اصلیت سے آگاہ کرنے کی ان کی ہمتیں بڑھانے اور احساس کمتری کے افسوں کا پردہ چاک کر کے نظام کائنات میں ان کی حیثیت کو نمایاں کرنے میں اپنی نظم شمع و شاعر سے بہت بڑا کام لیا ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی نام سے منزل مسلماں کی۔
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

جہاں۔ خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے.
کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کے زورِ بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

سچ تو یہ ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ سے تو مسلمانوں کی نشاۃ جدیدہ کی سحر طلوع ہوئی۔ خضر راہ میں اقبال نے مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایمان کی چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے۔ تو وہ پھر تقدیر کی صورت گری کر سکتا ہو

اقبال اسلام کے خاکستر گرم کی ایک چھوٹی سی چنگاری میں
بھی آفتاب دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھ رات کی تاریکی میں بھی
ان درخشاں ستاروں کو دیکھ رہی ہے۔ جو تعلیمات قدس کے فیض
سے مسلمانوں کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے
پہلے تو باری تعالیٰ کو پیش کیا۔ جو ایک مسلمان کے لئے بیش بہا
نعمت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عشق الٰہی اور قدرت کی رضا جوئی
سے قلب کو گرمانے کی تلقین کی اور کہا کہ توحید کی اصلی شان یہ ہے
کہ مومن اپنے دل کو خدا سے واحد ہی کا مسکن بنائے۔ اور اس
راہ میں جتنے مصائب بھی آئیں بے چون و چرا قبول کرلیں۔

عاشقی؟ توحید را بر دل زدن۔
وانگہے خود را بہر مشکل زدن

چونکہ مغربی تعلیم نے ایک قسم کی بے راہ روی پیدا
کردی تھی۔ اور مسلمان اپنے مذہب سے ایک حد تک بیگانہ
ہوتے جارہے تھے۔ انہوں نے اقیموا الصلوٰۃ پر عمل
چھوڑ دیا تھا۔ اور نماز جو اسلام کا زبردست ستون ہے۔ جس پر
نہ صرف اعمال و اخلاق ہی کا مدار ہے بلکہ اجتماع اور اتحاد کو بھی
برقرار رکھنے والی ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔
نہ کوئی بندہ رہا اور کوئی بندہ نواز۔

قطرۂ آب وضوئے قنبرے۔
در بہا برتر ز خون قیصرے۔

اللہ اللہ کتنی گرانمایا چیز ہے۔ ایک حبشی غلام کے وضو کے
ایک قطرہ کی قیمت قیصر کے خون سے بھی زیادہ؟

مغربی تعلیم اپنے ساتھ طرح طرح کے سراب رنگ
لائی نئے نئے جال پھیلائے۔ کتر چیزوں کو بڑھا چڑھا کر
بتلایا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ماحول اور فضا نے مسلمانوں کو اسی سانچہ
میں ڈھالنا شروع کیا۔ ان کی نظریں آخر تک کے شعبدوں
سے خیرہ ہونے لگیں ایسے میں اقبال نے تیز تیز چٹکیاں لیں
اور بتایا کہ دراصل وہ تعلیم جو اخلاقی اور معاشرتی صلاح و فلاح
کا باعث نہیں۔ بلکہ گمراہی کا موجب ہے کبھی سودمند نہیں ہو سکتی
ان کی نظر میں مسلمان اپنی شان کو اس وقت تک حاصل
نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ابوبکرؓ کا صدق عمرؓ کا عدل اور علیؓ
کی شجاعت نہ ہو۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا۔
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔

اس سراب رنگ و بو کو گلستان سمجھا ہے تو۔
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا ایک ثمر۔

وہ پھر کہتے ہیں کہ اگر ایمان کامل پیدا ہو جائے۔ تو ساری
مشکلیں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری۔
یہ سب کیا ہیں؟ فقط ایک نقطۂ ایماں کی تفسیریں۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی۔
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔

پیر مغان فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر۔
اسمیں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے۔

اقبال کا سب سے اہم پیام جس سے انہوں نے شروع سے

آخر تک مسلمانوں کیلئے پیش کیا وہ خودی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی سے ناواقف ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان میں کسقدر قوتیں پوشیدہ ہیں۔ خودی فقر و عشق کو انہوں نے مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے جس سے ہر مرتبہ ایک نئی کیفیت بڑائی شان اور بے پناہ جوش ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک مدت سے ہندی تصوف نے مسلمانوں کو ویدانتی فلسفہ کا گرویدہ کر لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سب کچھ ہے ہم کچھ نہیں ہیں۔ ہماری کائنات ہستی شبنم کے قطرے کی سی ہے اس جمود اور بے مائیگی کے طلسم کو توڑنے کیلئے اقبال نے زندگی کی نبضوں میں دوڑنے والا پیام دیا۔ ہم ہی ہم ہیں، اور کچھ بھی نہیں ہے ہم ایک قطرہ سہی لیکن یہ قطرہ ایک وسیع سمندر ہے۔ اس قطرہ کی چھوٹی سی موج جوش میں آجائے۔ تو زمین و آسمان کو بہا لیجائے اب دیکھنا یہ ہے کہ خودی ہے کیا؟ خودی کا ایک سادہ سا مفہوم تو یہ ہے کہ انسان کیلئے اپنی ہستی کا احساس ہی خودی ہے اسکے اندر کمالات کے تمام اسرار پوشیدہ ہیں۔ یہ احساس جتنا شدید ہوگا زندگی اس قدر استوار ہوگی۔ اور انسان کی زندگی جسمانی اور روحانی دونوں طرح سے ایک مستقل بالذات مرکز ہے خود اعتمادی کیساتھ ساتھ انسان الٰہی صفت اور فطری کمالات پیدا کرے۔ دوسروں کیلئے امن اور سلامتی کا مجسمہ بن جائے۔ اپنے اندر کشش اور جاذبیت پیدا کرے۔ اور اپنی روح ہی سے اپنے لئے سامان حیات حاصل کرے۔

کہ یک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو۔

اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو۔

اقبال نے قرب الٰہی کو خودی کا لازمی جز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرد جسقدر خدا سے دور ہوگا۔ اس قدر انفرادیت کمزور ہوگی۔ قرب الٰہی کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کی ذات میں واصل ہو جائے۔ "ہمہ اوست" کی رٹ لگائے بلکہ کامل انسان بننے کیلئے ضروری ہے کہ وہ خود خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔

در دشت جنون من جبریل [illegible] صید ہے۔

یزداں بکمند آور [illegible] ہمت مردانہ!

خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ انسان اپنے نفس کی پابندیوں سے آزاد ہو جائے۔ اور اس کا سینہ ایک ایسا آئینہ بن جائے جس میں جمال الٰہی پرتو فگن رہے

بانور خودی — بینہ خدا را۔

مختصر یہ کہ خودی کی جامع تعریف من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ہے۔ علامہ اقبال ایک آزاد مشرب انسان تھے۔ وہ تمام انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام اقوام کو ایک [illegible] ی بنا دیں۔ ایک ایسی دنیا قائم کر دیں جہاں محبت و مساوات کی حکومت ہو۔ اقبال ایک مسلمان ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا فلسفہ [illegible] عری سب کچھ اسی محور کے گرد جمع ہو گئی ہے جس کا مقصد صرف یہی ہے کہ لوگ اس نکتہ کو پالیں کہ اسلام ہی "فطرت کا مسلک" [illegible] ہیں۔ [illegible] نیا کی فاسد [illegible]۔ چنانچہ اس کی تعلیمات اقبال [illegible] قوم، [illegible] ب اور فرقہ بندی سے بالا ارفع ہے۔

جاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو ۔

میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی۔
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی۔

اقبال ایک مسلمان تھا، توحید کا پرستار اور اپنی قوم کا سچا بہی خواہ۔ اس نے اپنے نالہ ہائے جگر کو بار بار مسلمانوں تک پہنچانے اور انھیں متاثر کرنے کی کوشش کی ہر صاف صاف بتادیا کہ اسلام کے تمام ارکان میں اجتماعی احساس ہی مسلمانوں کو ایک مضبوط معاشرتی نظام میں باندھے رکھ سکتا ہے۔ ملت میں گم ہو کر افراد کی ہستی گم نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی معنی خیز ہو جاتی ہے اسی سلسلہ میں اقبال نے واضح کر دیا کہ کسی قوم کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس کے افراد میں وحدت خیال وحدت عقائد اور وحدتِ مقاصد پیدا ہو جائے۔ اور مسلمانوں کا مرکز اور مستعید ان کا مذہب ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں۔
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں۔
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں
دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی۔

غرض اقبال کے بلند تخیل اور افکار عالیہ کا مسلمانوں پر کافی اثر ہوا۔ اور ابھی یہ اثر آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ تن آسانی اور مغرب کی ہوش پرستی سے یہ جو اپنی منزل سے دور ہٹ گئے تھے۔ پھر ان کا رخ اپنی حقیقی منزل کی طرف ہو گی اقبال نے ان کے سینوں میں مضطرب دل جو آرزوں سے بے قرار اور جستجوئے حقیقت میں سرگرم ہو پیدا کر دیا۔ ان کی پست ہمتی گھٹیا حوصلے اور یاس و ناکامی کی سنگلاخ چٹانیں سرکنے لگیں۔ ان میں زندگی کی قوت اور رگوں میں جوان خون دوڑنے لگا۔ اور مسلمانوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ جادۂ عمل پر گامزن ہو کر زندگی کی نبرد آزمائیوں میں شریک رہیں گے سب سے بڑی چیز یہ کہ انھیں احساس ہو گا کہ مسلمان کی حقیقی منزل عشق الہیٰ ہے۔ اور صحیح راستہ مذہب اسلام! اس دائرے میں رہ کر وہ پھر ایک بار اپنی شوکت و عظمت حاصل کر سکتے ہیں۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

قطعات

چاند کی بکھرنے والی روشنی
رقص فرما ہر کرن مہکی ہوئی۔
پھیر لیں نگاہیں جیسے
رات بھر اگر نہ جائے زندگی

زاہد یہ تیرا دین بھی کیا ہے توبہ
توبہ کی ہر ایک رند کو تلقین ہے توبہ
میں بندۂ آزاد ہوں تو بندہ عاجز
توبہ کروں گا مری توہین ہے توبہ

نیاز حمید ناتمام

زمانہ

علی اشرف اڈیٹر تنظیم

آلام کی گردوں پہ گھٹا چھائی ہوئی ہے۔
محروم ہوا رحمت و راحت سے زمانہ۔
بے چین ہے بیخواب ہے حیران ہے دنیا۔
صد حیف کہ انسان ہے انسان کا قاتل

آفات کی دنیا میں بہار آئی ہوئی ہے۔
ہستی غم و افکار سے تھرائی ہوئی ہے۔
دیکھو جدھر اک برق سی لہرائی ہوئی ہے۔
بربادیٔ دوراں کی خبر آئی ہوئی ہے۔

یا ہے کوئی تعمیر نئی بطن قضا میں
یا فطرت بیدار کو نیند آئی ہوئی ہے

خونریز حرارت سے پگھلتا ہے زمانہ
مجروح ہے نوع بشری دیکھ لیا ہے۔
ٹھہری ہوئی اک حال پہ ہے موج کشاکش
ہستی کے نظر آتے ہیں بدلے ہوئے تیور

ہر سانس نئی آگ اگلتا ہے زمانہ۔
کروٹ کوئی پھر تازہ بدلتا ہے زمانہ
گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے نہ چلتا ہے زمانہ
انسان کے قابو سے نکلتا ہے زمانہ

بیدار میں ڈوبی ہوئی عقلوں کو خبر دو
ہشیار کہ اب پھر سے بدلتا ہے زمانہ۔

کچھ روز میں یہ دور پریشان نہ رہے گا
اٹھ جائینگے دنیا کی نگاہوں کے حجابات
گر جائیگی خود کٹ کے یہ زنجیر غلامی
پرواز سے آگاہ ہوا طائر مجبور
ہموار سی اک سطح نظر آئیگی ہر سمت
بدلے گا نیا روپ بھی اور تباہی
کھل جائینگے اسرار حیات ابدی سب

سامان جنون فتنہ سامان نہ رہے گا۔
پردے میں کوئی سلسلہ جنباں نہ رہے گا۔
نشتر کوئی نزدیک رگ جان نہ رہے گا
اب دام سیاست میں پر افشاں نہ رہے گا۔
یہ بندۂ مزدور یہ دہقان نہ رہے گا۔
یہ فرق گلستان و بیاباں نہ رہے گا۔
انسان یہاں سر بہ گریباں نہ رہے گا۔

ہو جائینگے دل جلوۂ عرفان سے درخشاں
دنیا میں کوئی منکر یزداں نہ رہے گا۔

شمس

جناب جی یم خان - ایم - اے
بی - ایس - سی - اے - ایم ٹی سی (اڈنبرا)

خیال کیا جاتا ہے کہ ارضی کرۂ ہوائی میں سے گذرنے کے بعد آفتاب کی حرارت اور روشنی کی مقدار میں صرف کمی ہی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی قیمتوں میں بھی تحلیف پیدا ہوجاتی ہے یعنے ان کی نوعیت متبدل ہوجاتی ہے ہماری زمین کے کرۂ ہوائی سے باہر نکل کر اگر سورج کو دیکھیں تو بجائے گہرا زرد کے وہ نیلا رنگ کا دکھائی دیگا۔

سورج کا بذات خود روشن رہنے اور فضا میں مسلسل حرارت اور روشنی پھینکتے رہنے کے کئی نظریہ ہیں اوّل فضا کا مادہ بشکل شہاب (METEOR) ہر وقت اور ہر لمحہ جاذبہ کے تحت اس میں آکر گرتا رہتا ہے اور جس کی تیز رفتار کے ایکدم رک جانے سے حرارت پیدا ہوکر جمع ہوتی رہتی ہے اور یہی وہ حرارت ہے۔ جو سورج فضا میں بے دردی سے بکھیر رہا ہے۔ دوم جب کوئی چیز سکڑتی ہے۔ تو اس فعل سے حرارت کی پیدائش ہوتی ہے۔ اور یہ کہ سورج خود بخود سکڑ رہا ہے۔ اور اس طرح کافی تعداد میں حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ اس کی آفرینش میں افزائش کا سلسلہ جاری رہکر اسکی حرارت کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر یہ نظریہ مان لیا جائے تو اس فعل سے سورج کے حجم میں ... ۲۰ فٹ فی سال سے کمی واقع ہوتی ہے گی یہ شرح مقدار اسقدر کم ہوگی کہ کئی صدیوں کے مشاہدہ کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ سکیگی ایک [illegible] نظریہ کافی عرصہ [illegible]

مقبول تھا۔

تیسرا نظریہ جو آج کل زیادہ تر مقبول ہورہا ہے وہ یہ ہے کہ سالمات کے توڑ پھوڑ سے جو توانائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ سورج کی توانائی کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس کی افزائش اسقدر کافی مقدار میں ہو رہی ہے۔ کہ کوئی آدمی بھی صحیح طور پر یہ بتانے سے قاصر ہے۔ کہ آئیندہ چلکر اس میں کبھی کوئی کمی بھی واقع ہوسکیگی۔ بہرحال یہ بتانا محال ہے کہ سورج کب ٹھنڈا ہو جائے گا۔ [نیو کومب (NEW COMB)] کا خیال ہے کہ اس کے لئے ایک کروڑ سال درکار ہونگے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ابھی کروڑوں برس تک اس کا امکان نہیں۔ ہاں البتہ جب کبھی ایسا ہوگا۔ تو ہماری زمین سب سے پہلے متاثر ہوگی۔ سورج سے جو حرارت وصول ہوتی ہے اور جو زندگی کو یہاں قائم رکھنے کیلئے ازبس ضروری ہے۔ جب اس میں ایک معتد بہ کمی واقع ہوگی اس وقت زمین بھی نسبتاً ٹھنڈی ہوجائیگی اور آہستہ آہستہ جملہ زیست بھی مفقود ہو جائیگی۔ لیکن تشویش کا مقام نہیں کیونکہ کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ کب ایسا ہوگا اور نہ کوئی اس کا وقت مقرر کرسکتا ہے۔ اس کا علم تو صرف اسی علام الغیوب کو ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔

سورج کا سطحی درجہ حرارت ... ۶۰۰۰ ڈگری سنٹیگریڈ ہے اور اس [illegible] تمام [illegible] باتیں بخار بن جاتی ہیں

اور زمین پر کوئی بھٹی اس وقت تک ایسی نہیں تیار کی جاسکی جو اس درجہ حرارت کو برداشت کر سکے۔ گو فضا میں ۲۰۰۰ درجہ حرارت تک تو پیدا کیا جا چکا ہے۔ سورج کا مرکز دو کروڑ درجہ حرارت پر ہے۔ اسکی اوسط اضافت کثافتی ( ) پانی کی ۱.۴ ہے لیکن مرکز یہ پارہ کی چھ گنا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سورج کی تخلیق ۱۰ ارب سال سے ہوئی ہوگی۔

۶۰۰۰ درجہ حرارت پر بہت سی پیچیدہ چیزوں کی ترکیب ٹوٹ کر الگ الگ ہو جاتی ہے۔ اور سورج کی فضا میں عناصر صرف بھاپ کی صورت میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے موجود ہیں۔

موجودہ زمانہ میں علم طبیعات کے رو سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔ کہ مادہ کے اندرونی حصے یعنی جوہر کے ( ) خوردبینی مراکز میں جس سے تمام مادہ اشیاء ترکیب پاتی ہیں ایک بہت بڑی مقدار توانائی کی پوشیدہ طور پر جمع ہے بہت بلند درجہ حرارت پر جوہروں کے ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں یہ توانائی بہت بڑی مقدار میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے ریڈیم میں سے (PARTICLES) ۲۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے خود بخود باہر آتے رہتے ہیں۔ سورج کے مرکزی درجہ حرارت پر ہائیڈروجن ( ) اور لیتھیم (LITHIAM) چند سکنڈ میں ہی ہیلیم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر ہائیڈروجن اور کلورین میں رد عمل مقصود ہو تو صرف اس کا آدھا حصہ تبدیل ہونے میں

۱۰ سال کی مدت درکار ہوگی چونکہ اسقدر درجہ حرارت دنیا کی کسی معمل میں پیدا کرنا ممکن نہیں اس لئے ذرے یہ جو سالمات کے ٹوٹنے سے توانائی حاصل ہو سکتی ہے اس کو اپنے زیر اقتدار لانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہمارے سورج کی توانائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ خیال ہے کہ آج سے دس عرب (۱۰٬۰۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰) بعد اسکی روشنی کی چمک اپنی معراج پر ہوگی بس بعد اس میں کمی ہونا شروع ہو کر پچاس لاکھ سال میں اتنی کمی واقع ہوگی کہ دنیا میں جملہ چیزیں سردی سے تباہ ہو جائیگی۔ یہ وقت ہوگا جب سورج میں کی جملہ ہائیڈروجن تقریباً ختم ہو چکی ہوگی۔ اور سوائے ایسے چھوٹے جراثیم کے جو گرم کھولتے پانی میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور کوئی جاندار زمین پر زندہ نہ رہ سکیگا۔ اسی دوران میں اسکی جسامت بھی کم ہوتی جائیگی۔ گویا اس طرح سورج کی موت واقع ہوگی لہذا ہم کو اپنی زندگی میں تو کیا بلکہ انسانی زندگی میں بھی اس بات کا خطرہ نہیں کہ اس واقعہ سے دوچار ہوں۔

سورج کی حالت اپنی موت کے وقت ایک دیوہیکل ذی روح دیئے (LUMP) کی ہوگی جو چاروں طرف سے دائمی برف سے ڈھکا ہوا ہوگا اور اس وقت بھی اس کے ساتھی سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہونگے لیکن یہ بھی اس طرح دائمی برف پوش ہو چکے ہونگے اس کا قد مشتری سے بڑا ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ اس سے

چھوٹا ہو جائے ورنہ اگر اس سے بڑا ہو تو اسکی اندرونی حالت
ٹھوس مادہ کی شکل میں نہ رہے گی اس لئے کہ مشتری سے بڑے
سیارے کا وجود ٹھوس قائم نہیں رہ سکتا ورنہ اس کے وزن کے
انتہائی دباؤ کے تحت تمام جواہرات پگھل کر مادہ سیال حالت
کو پہنچ جائے گا۔ اور یہ صفت ٹھوس ہونے کے منافی ہے۔ لہذا
ٹھنڈا اور مردہ ہو کر سورج غالباً مشتری سے چھوٹا ہی ہو کر
رہ جائے گا۔ اور چاند کے مانند آئندہ کے ایام کس مپرسی
کے عالم میں گذارنا شروع کر دے گا۔ ایسی صورت میں سورج کے مرکز
پر مادہ اتنا کثیف اور وزنی ہوگا کہ یک مکعب سنٹی میٹر کا وزن
۳۰ ٹن ہوگا۔

اگر ہمارا سورج بھی دوسرے اور ستاروں
(SUPER Novae) کے مانند یکایک مشتعل ہو کر
دھماکے سے پھٹ کر ان کے مانند ردش ہو جائے۔
تو اس کی روشنی اور حرارت کروڑوں گناہ زیادہ ہو جائے
اور زمین کی کل اشیاء اور خود زمین بھی چشم زدن میں بھی کم وقفہ
میں رقیق گیس میں منتقل ہو جائینگے۔ اور کسی کو یہ بھی پتہ معلوم
ہوگا کہ کیا ہوا۔ اور بہت ممکن ہے کہ قیامت اسی طرح سے
قائم کی جائے۔ واللہ اعلم بالصواب"

گذارش

ہمارے بعض کرمفرما منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا پورا پتہ
نہیں لکھتے جس کی وجہ سے چندہ پہنچنے کے باوجود ان کو پرچہ
نہیں ملتا۔ پتہ نہ ہونے کے باعث ہمیں مجبوراً خاموش ہو جانا
پڑتا ہے۔ براہ کرم پتہ مکمل اور صاف لکھا کریں۔

منیجر

سرودِ مستانہ

عزیز احمد بی۔ اے

مست آنکھوں میں چھلکتا ہے شباب اے ساقی
ساری دنیا ہو جاتی ہے خراب اے ساقی
مست آنکھیں تیری مدہوش ہوئی جاتی ہیں۔
کون دے ساغر صہبا کا جواب اے ساقی
دستِ رنگین سے لبوں تک میرے جام آتا ہی
کیا یہ بیداری ہی یا عالم خواب اے ساقی
رازِ میخواری کا پھر مجھ سے چھپایا نہ گیا
جب سے آوارہ ہوئی بوئے گلاب آ ساقی
مست رہتے ہیں میری نظروں سے خودی کے
چھایا ہے سرِ میخانہ سحاب اے ساقی
میں بلا نوش بھی منت کشِ ساغر نہ ہوا
اُف یہ توخیز تیرا کیف شباب اے ساقی
باتیں کو دن میں ہیں الفت کا فسانہ لب پر
کیا ہوا تیرا وہ پہلا حجاب اے ساقی
اک ذرا چھیڑ دے مضراب نظر سے اپنے
ہر نفس ہے میری ہستی کا رباب اے ساقی
کس کے گستاخ لبوں نے اسے چھیڑا ہے عزیز
منہ چھپا لیتی ہے کیوں موجِ شباب اے ساقی

انتساب

خورشید احمد جامی

چند راتوں کی جوانی۔ چند آہوں کا دھواں
میرے وہ نغمے کہ جن میں کانپتی ہیں بجلیاں
جو وطن کی سرزمین پر ایکدن چھا جائیں گے
ان غلامانِ کہن کی روح کو چونکائینگے۔

جگمگا ئینگے فضائے زندگی میں جھوم کر
مسکرا ئینگے ستاروں کی جبین چوم کر
غیرت مردانگی لائیں گے سینوں کے لئے
بانکپن آزادیوں کا مہ جبینوں کے لئے

آتشینِ احساس بخشینگے دلِ ناشاد کو
پیار کرنے کے لئے ہر لمحۂ آزاد کو
چھین لائینگے غضب آلود نظروں کا شباب
ہر نفس کے ساتھ لہرائیگی برق انقلاب

عشق و الفت کا نہ رومانی فسانہ بن سکیں
ہمتوں کے واسطے جو تازیانہ بن سکیں
میرے وہ نغمے اگر مقبول ہوں محبوب ہوں
چاہتا ہوں میں کہ تیرے نام سے منسوب ہوں

فن کار

عبدالماجد ماجد (عثمانیہ)

کردار

جاوید — — ایک نوجوان

قصری — — جاوید کا دوست

زرینہ — — جاوید کی محبوبہ

نرگس — — رقاصہ

مقام — — ہندوستان کا کوئی شہر

وقت — — حال

جدید طرز کے سجے ہوئے کمرہ میں جاوید اور قصری بیٹھے ہوئے ہیں جاوید کے چہرے کے نقوش دیکھنے سے یہہ پتہ چلتا ہے کہ وہ خوش باش تھا خوبصورت اور تن ومند بھی ہوگا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے کوٹ کے بٹن کھلے صوفہ پر نیم دراز ہے زانو پر بربط رکھا ہوا ہے بمقابل کے صوفہ پر قصری بیٹھا ہوا ہے۔ گھڑی گیارہ بجا رہی ہے۔

جاوید (دھیمی لے میں) اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن

جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے۔

یہہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو

جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

(ایک ہنسی ہنس کر) جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا؟ دیوانے چیخنے والے سازوں کی جھنکار میں زندگی کا سکون ڈھونڈتے ہیں۔ کیا جانیں کہ زندگی خود تڑپنا چاہتی ہے میرا یہہ بربط بھی تڑپنا چاہتا ہے زندگی درد کی چیخ بن کر رہنا چاہتی ہے قصری تم گاتے ہو میں بجاتا ہوں آؤ زندگی کو ہم چیخوں میں بدل دیں!

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے۔
یہہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

اقبال رحمۃ اللہ علیہ

قصری۔ کیا ہو رہا ہے جاوید تمھیں؟

(گھٹی ہوئی آواز میں) کیا ہو رہا ہے... سمندر میں طوفانی موجیں اٹھ رہی ہیں اور تم پوچھتے ہو کیا ہو رہا ہے۔ دیوانے نغمہ کی معراج جنون کی آغوش میں ہوتی ہے گاؤ قصری میں اپنے ساز کی ہر تان کو

جنوں کی آغوش میں ڈال دینا چاہتا ہوں میں
فنکار ہوں گاؤ قمری سے

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

(قمری اونچے سروں میں گاتا ہے جاوید اپنا ربط چھیڑتا ہے)

قمری ۔ اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

(جاوید کمرے کی چھت کی جانب گھورنے لگتا ہے جیسے
خلا میں کچھ دیکھنا چاہتا ہو)

جاوید ۔ (یکایک چونک کر) زمانہ اپنے رخ سے نقاب اٹھا
رہا ہے ۔ زندگی تاریک سایوں سے گذرتی ہوئی
نورانی فضاؤں میں [illegible] ہے قمری [illegible]
سب ہے خواب ہے [illegible]
دو مجھے (جاوید کھڑا ہوتا ہے [illegible] ٹوٹ [illegible]
[illegible] رکتا ہے)

قمری ۔ جاؤ گے ۔ اس تاریک رات میں کہاں جاؤ گے جاوید
جاوید ۔ وہیں جاؤں گا جہاں سے گم ہو کر نکلا تھا ۔ جانے
دو مجھے (جاوید آگے بڑھتا ہے باہر بجلیاں
چمک رہی ہیں طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں ۔

قمری ۔ جاوید ۔ ٹھہر جاؤ ۔ طوفان آنے کو ہے ۔
جاوید ۔ کوئی طوفان دل کے طوفان سے بڑا نہیں (تیزی
سے باہر نکل جاتا ہے)

دوسرا سین

(رات بہت زیادہ تاریک ہے اس ہوا میں تیزی
نہیں ہے ۔ ہلکی ہلکی بارش بھی ہونے لگی جاوید ایک
دروازے پر دستک دیتا ہے ۔ ایک نوجوان عورت
قندیل لئے دروازہ کھولتی ہے ۔ آنکھیں سرخ ہیں
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہت زیادہ آنسو بہائے
ہیں چہرہ اداس ہے ۔ جاوید کو دیکھتے ہی ایک قسم
کی تازگی سی چہرے پر دوڑ جاتی ہے ۔)

زرینہ ۔ جاوید تم ۔ ۔ ۔ اتنی رات گئے ۔
جاوید ۔ ہاں میں ۔ اندر آجاؤں
زرینہ ۔ آجاؤ ۔ (زرینہ راستہ دیتی ہے جاوید گھر میں داخل
ہوتا ہے اور ایک صوفہ پر جو کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا ہے پانی
بالوں میں سے ٹپک [illegible])
کیسی حالت کر رکھی ہے تم نے اپنی
جاوید ۔ مجھ سے پوچھتی ہو ۔ اپنے سے کیوں نہیں پوچھتی
زرینہ ۔ اوہ ۔ بھول جاؤ جاوید ۔ فنکار ساری دنیا کو بھول جاتا ہے
جاوید ۔ بھولنا تو چاہتا ہوں زرینہ ۔ میں ہر چیز کو بھولنا چاہتا
ہوں خود کو تم کو ۔ لیکن یہ ساز تمہارا دیا ہوا یہ
مجھے ماضی کی طرف لیجاتا ہے ۔ زرینہ اسے لے لو ۔

میرا ٹوٹا ہوا ساز مجھے کافی ہے ٹوٹا ہوا ساز ٹوٹے ہوئے نغمے

ٹوٹی ہوئی زندگی تم اور بس ہو زرینہ کیا سوا تمہیں۔

زرینہ ۔ جاوید ٹوٹی ہوئی زندگی کا تماشہ کیوں بنانا چاہتے ہو تم

میں بھی تھک گئی ہوں جاوید تم اپنے نغموں کی گہرائیوں

میں غرق کیوں نہیں کر دیتے مجھے۔

جاوید　میرے نغمے ۔ زرینہ کہاں ہیں میرے نغمے ٹوٹے ہوئے

ساز سے ٹوٹے ہوئے نغمے ہی نکلیں گے (زرینہ

جاوید کو غور سے دیکھتی ہے) اور ہی ہو مجھ سے

دیوانہ سمجھتی ہو مجھے ۔ تم ہی نے تو کہا تھا نغمہ جنون کی

آغوش میں نغمہ بنتا ہے فنکار بننا چاہتی تھیں نا تم۔

زرینہ　ہاں فن کار بننا چاہتی تھیں ۔ لیکن میری زندگی

آہوں میں کیوں بدل جائے ۔ جاوید میرا بڑھتا

ہوا ہاتھ تھام لو ۔ تھامتے کیوں نہیں تم مجھے اپنی

آغوش میں کھینچ کیوں نہیں لیتے جاوید تم۔

جاوید ۔ (بات کاٹ کر) میرے نغموں سے تڑپ چھین لینا چاہتی

ہو زرینہ ۔ فن کار نہیں بناؤ گی (تیزی سے دروازے

کی طرف بڑھتا ہے۔ زرینہ پکارتی ہے لیکن جاوید

چلا جاتا ہے۔

زرینہ　چلے گئے ۔ میری بات بھی نہیں سنی ۔ کب تک

دبا سکوں گی میں اپنے دل کی آگ (صوفہ پر

اوندھے منہ گر کر سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

تیسرا سین

(آسمان صاف ہے کہیں کہیں سلگتے بادلوں کے

ٹکڑے تیر رہے ہیں جاوید ایک کچے مکان کے

برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے چہرے سے دماغی تھکان

ظاہر ہو رہی ہے۔

جاوید ۔ (مسکرا کر اپنے آپ کو) چاہتی تھی کہ میں اسے اپنی

آغوش میں کھینچ لوں ۔ میرے نغموں سے تڑپ

چھیننا چاہتی تھی وہ ۔ (ڈوب کر) محبت کچھ

مانگ رہی تھی لیکن ۔ لیکن میرا ساز اس کی پیاس

بھی تو نہیں بجھا سکا ۔ یہ ساز ۔ میری ہاری ہوئی

زندگی کی ایک تھکی ہوئی آہ ہے ۔ میرا ساز تھک

گیا ہوگا یہ بھی مضراب کی ضرب سہتے سہتے ۔ میں

بھی تھک گیا ہوں (ربابہ کے ایک تار کو چھیڑتا ہے

گھر کا دروازہ کھلتا ہے ایک عورت پیروں میں

گھنگرو پہنے باہر آتی ہے جاوید اسے تھوڑی دیر

دیکھتا ہے عورت ذرا مسکراتی ہے)

جاوید ۔ کون ہو تم

نرگس　میں نرگس ہوں رقاصہ ہوں کچھ بجاؤ

(جاوید ربابہ پر ایک درد انگیز نغمہ چھیڑتا ہے

نغموں میں اداسیاں اور تھکن پھیل جاتی ہیں۔

نرگس　کتنا درد ہے تمہارے نغموں میں زندگی ایک آنسو

بن کر رہ جانا چاہتی ہے۔

جاوید　ہاں زندگی کی ابتدا بھی آنسو ہے اور

انتہا بھی آنسو۔

نرگس　کیا نام ہے تمہارا۔

جاوید ۔ میرا جاوید ۔ ناچوگی میرے ساز پر

نرگس　کیوں نہیں لوگ کہتے ہیں جب میں ناچتی ہوں کائنات کا ذرہ ذرہ پائل کی جھنکار بنکر جھوم اٹھتا ہے زندگی بھی رقص کرنے لگتی ہے (مسکراکر) کتنے عجیب ہوتے ہیں یہ لوگ بھی آج میں ناچونگی میرے رقص کو تمہارے نغموں کی ضرورت تھی بجاؤ میں ناچونگی اتنا ناچونگی کہ ساری دنیا میرے ساتھ ناچنے لگے ۔ آسمان سے تارے ٹوٹیں اور پائل کی جھنکار میں ڈوب جائیں ۔

جاوید　اوہ تو تم بھی فن کار ہو ناچو ۔

(جاوید ساز چھیڑتا ہے ۔ نرگس ناچتی ہے یکایک ربابا کا تار ٹوٹ جاتا ہے نرگس رک جاتی ہے جاوید نرگس کا منہ تکنے لگتا ہے ۔)

نرگس　جھنکر) ٹوٹ گیا ۔ تار ٹوٹ گیا ۔

جاوید　ہاں تار ٹوٹ گیا تھک گیا ہے نا مضراب کی ضرب سہتے سہتے ۔ زندگی کا سانس بھی ایسے ہی ٹوٹ جائے گا ایکدن (اٹھ کھڑا ہوتا ہے نرگس پکڑ لیتی ہے)

نرگس　کہاں جا رہے ہو — کہاں جا رہے ہو تم

جاوید　میں نے منزل کا تعین نہیں کیا ہے ابھی ۔ قدم اٹھ رہے ہیں کہیں پہونچا دینگے

نرگس　تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے اپنے متعلق کچھ نہیں جانتے

جاوید　ہاں وہ کہتی تھی فنکار اپنے آپکو جب تک فراموش نہیں کر دیتا فنکار نہیں بنتا ۔ نرگس وہ چاہتی ہے کہ میں اپنے آپ کو بھی بھولجاؤں ساری دنیا کو بھول جاؤں وہ مجھے فنکار بنانا چاہتی ہے ۔

نرگس ۔ کون ؟

جاوید ۔ زرینہ

نرگس　زرینہ ۔ لیکن کہاں بھٹکتے پھروگے تم آؤ میرے ساتھ رہا تھ پکڑ کر کھینچتی ہے)

جاوید ۔ تمہارے ساتھ ۔ نہیں نرگس

نرگس ۔ کیوں نہیں میں تمہیں تماشہ بننے نہیں دونگی چلو اندر (کھینچتی ہوئی اندر لے جاتی ہے جاوید غیر ارادی طور پر چلا جاتا ہے ۔

چوتھا سین

(زرینہ کا مکان ۔ ڈرائینگ روم میں قصری متفکرانہ بیٹھا ہے ۔ زرینہ دوسرے صوفہ پر نیم دراز ہے آنکھوں سے آنسوں جاری ہیں)

قصری ۔ زرینہ ۔ اتنی جلدی ہار گئیں ۔

زرینہ ۔　قصری وہ اپنی منزل کیطرف بڑھے جا رہے ہیں ۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی قصری

قصری ۔ مغنی کے دل کی پیاس اس کے ساز کی تانوں سے بجھتی نہیں بڑھتی ہی جاتی ہے ۔ زرینہ تم نے اس کے نغموں میں بے تابی کی روح بھر دی ہے تم نے اسے فن کار بنا یا ہے ۔

زرینہ ۔ لیکن مجھے کیا ملا مجھے کیا ملا

قصری ۔ تم کو کیا ملا۔ تم نے سب کچھ کھو کر بہت کچھ پالیا۔ تم
کیا نہیں ہو زرینہ تم اس کے نغموں کا سحر ہو تمہاری
یاد اس کے ساز سے درد کی مان بن کر اٹھتی ہے
زرینہ وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اسے آگے بڑھنے دو
بڑھنے دو زرینہ ۔

زرینہ ۔ آگے بڑھنے دوں۔ لیکن میں۔ میں کہاں
رہونگی قصری ۔

قصری تمہارے آگے بڑھنے والے قدم اس کی راہ
بدل دیں گے زرینہ باہر سے بربط اور گھنگروؤں کی
ملی جلی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ زرینہ اور قصری ایک
دوسرے کو دیکھتے ہیں جلدی سے نیچے آتے ہیں جاوید نرگس
کے مکان پر بیٹھا بربط بجا رہا ہے۔ اور نرگس
اس پر مستانہ وار ناچ رہی ہے ۔

زرینہ ۔ جاوید۔ (پکارتی ہے) جاوید

جاوید ۔ (ساز روک کر) کون ۔ کون ہو تم

زرینہ ۔ میں جاوید ۔ میں زرینہ مجھے نہیں جانتے۔

جاوید ۔ (پھیکی مسکراہٹ سے) میں خود کو نہیں پہچانتا میں کسی
کو نہیں جانتا سنا تم نے

زرینہ ۔ تم ۔ جاوید یہ لڑکی کون ہے ۔

نرگس ۔ میں ۔ میرا نام نرگس ہے ۔

زرینہ نرگس ۔ جاوید نرگس کون ہے تمہاری بولو
نرگس کون ہے تمہاری

جاوید نرگس؟ ۔ میں کسی کو نہیں جانتا ۔ میں صرف
اپنا ساز چھیڑنا جانتا ہوں۔ میرا ساز ۔ اس سے
سنو میرے دل کی دھڑکنوں کی آواز اس سے
پوچھو میری منزل ۔

زرینہ ۔ (روتے ہوئے) قصری وہ کسی کو نہیں پہچانتے
قصری انہوں نے خود کو بھلا دیا ہے ۔

جاوید ۔ ہاں کسی کو نہیں پہچانتے۔ خود کو بھی نہیں جانتے
کسی نے کہا تھا۔ فنکار ساری دنیا کو بھول جاتا
ہے نغمہ جنون کی آغوش میں پرورش پاتا
ہے ۔ میں نغموں کو جنون کی آغوش میں لٹا
دیا ہے میں نغموں کی جھنکار میں گم ہو گیا ہوں ۔
ہاں بہت دور ہوں میں

نرگس تم ہی زرینہ ہو بہن

زرینہ ۔ ہاں

نرگس ۔ کچھ دن پہلے تمہارا نام لیتے رہتے تھے اب
وہ خود کو بھول چکے ہیں

زرینہ (پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) نہیں وہ
مجھے نہیں بھول سکتے وہ مجھے نہیں بھول سکتے ۔
جاوید یہ ساز ۔ اسے بجاؤ جاوید اسے بجاؤ
پھر تم مجھے یاد کر لوگے تم کہتے تھے میرا دیا ہوا
ساز تمہیں ماضی کی طرف لیجاتا ہے ۔ بجاؤ جاوید بجاؤ

جاوید سن سکوگی میرا ساز ۔ اچھا ۔
(انتہائی اونچے سروں میں بربط چھیڑتا ہے
زرینہ جیسے اطمینان کا سانس لیتی ہے)

زرینہ ۔ جاوید اب دیکھو میری طرف مجھے دیکھو جاوید
مجھے پہچاننے کی کوشش کرو میں ۔ میں
زرینہ ہوں ۔ تمہاری زرینہ
یکایک تار ٹوٹ جاتا ہے ۔
(جھنکار) ٹوٹ گیا ۔ تار ٹوٹ گیا ۔

جاوید ۔ (ہانپتے ہوئے) ہاں ٹوٹ گیا ۔
زرینہ ۔ اوہ ۔۔۔ (گر کر بیہوش ہو جاتی ہے)
قمری ۔ بچاؤ جاوید ۔ اسی کو بچاؤ
جاوید ۔ اس کو ۔۔۔ اب نغمہ نہیں نکلے گا اس
سے اس کی روح چھن گئی ۔ سنا تم نے اب یہ
نہیں بجے گا کبھی نہیں ۔

ساز پھینک دیتا ہے ۔ قمری اور نرگس دونوں
جاوید کو پکارتے ہیں ۔ جاوید آگے بڑھتا ہے

قمری ۔ جاوید ۔ کہاں جا رہے ہو ۔
جاوید ۔ (اپنی دھن میں گنگناتا ہے آواز ٹوٹی
ہوئی ہے)
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی
شکست کی آواز ۔ اور آہستہ آہستہ نظروں
سے غائب ہو جاتا ہے قمری اور نرگس
دیکھتے رہ جاتے ہیں ۔

پردہ

ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے

مسرت خلش آزما چاہتی ہو
تبسم کا پیکر بنا چاہتی ہو
ذرا خود ہی سوچو یہ کیا چاہتی ہو
ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے ۔

نہیں ہیں یہ اپنے لئے چاند تارے
یہ سبزہ، یہ گل، یہ چمن، یہ نظارے
ہماری محبت ہے غم کے سہارے
ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے

ہمارے جہاں میں نہ راحت نہ خوشیاں
ہمارے جہاں میں ہے وحشت فراواں
ہر اک گام پر ہیں تباہی کے ساماں
ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے

خلش، اضطراب، اور دردِ مسلسل
نگاہوں میں غربت کے شعلوں کی ہلچل
ہر سو گرجتے ہیں وحشت کے بادل
ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے

نہ زرداریاں ہیں، نہ دولت نہ شاہی
پشیماں، پشیماں سی ہے بے گناہی
پس و پیش منڈلا رہی ہے تباہی
ہمارے لئے شادمانی نہیں ہے

تحسین سروری

رپورٹر

سردار الہام

بن بلائے مہمان یعنی ہر کانفرنس، جلسے، سالانہ اجلاس، غرض جہاں چار آدمی جمع ہوں یقین رکھئے کہ کم از کم ایک عدد رپورٹر ضرور موجود ہوگا۔ حتیٰ کہ وہ مداری کا تماشہ یا کسی دوائی کے مشتہر نے کیوں نا سڑک گھیر رکھی ہو۔

ہئیت کذائی۔ بال پریشان، برہنہ سر، ایک میلا کچیلا قمیص کمر پر بے سے لٹکتی ہوئی پتلون اور ایک ہاتھ میں کاغذ کا پلندہ دوسرے میں پنسل۔ جیب میں ایک بری طرح گھسا ہوا ربڑ کا ٹکڑا اور ایک کند قلم تراش۔ چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں۔ سہی واہی تباہی لئے ڈھنگے انداز سے ہر جگہ بلائے بے درمان کی طرح موجود۔ سب سے پہلے پہونچیں اور ایک ایک کرکے جب تک سارا مجمع کھسک نا جائے ملنے کا نام نہ لیں۔

قابلیت۔ بس واجبی واجبی سی ہوگی۔ کچھ انگریزی کے الفاظ یاد ضرور ہونگے اب اس کی قطعاً فکر نہیں کہ ان کا استعمال بھی درست طور پر معلوم ہو۔ تقریروں کا لفظ بلفظ لکھنے کی کوشش کریں گے یہ اور بات ہے کہ شومیٔ قسمت سے ہر کوشش ناکام ہی ثابت ہو۔ الفاظ کے صحیح املا پر دھیان دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور اگر املا غلط ہونے کے باعث مفہوم بدل جائے تو وہ اپنا نہیں بالا کا قصور ہے۔

تجربہ۔ تجربہ تو بس یہی کہ ناکام کلرک ثابت ہونے پر دفتر سے نکلنا پڑا۔ میٹرک کا ایک آدھا پرچہ باقی رہ گیا ہو۔ خواہ میٹرک کی سند تمام عمر دستیاب نہ ہوسکے لیکن خود کو کسی گریجویٹ سے کم سمجھنا صحافتی نقطہ نظر سے باعث توہین۔ کسی سستی قسم کے ایڈیٹر۔ اخبار جی نے کچھ الٹے سیدھے گر اور دو چار الم غلم اصول سمجھا دیئے ہوں تو کام چل ہی جاتا ہے۔

انٹرویوز۔ بڑے آدمیوں سے ملنے کا شوق نہیں خبط ہوگا خواہ کوئی فی الواقعی "بڑا آدمی" بھی ہو یا نہیں اس سے کیا مطلب۔ دو ایک ہوٹلوں میں تذکرہ اور کسی سے سن لیا بس مارے مارے اس کی تلاش میں پھریں گے۔ بدقسمتی سے تلاش بے سود ثابت نہ ہوئی تو سمجھو کہ میدان مار لیا۔ اب اس سے بحث نہیں کہ وہ بڑا آدمی کوئی پہلوان، کسی سرکس کا مینجر یا ڈانسک پارٹی کا جوکر ہی کیوں نہ ہو۔ اور گفتگو کچھ اس قسم کی ہوگی۔

(۱) رپورٹر۔ آپ کا سوراج کے متعلق کیا خیال ہے۔

پہلوان۔ اجی سوراج کی بھی ایک رہی میں تو گاماں کو بھی چت کر دوں۔

(۲) رپورٹر۔ کیا آپ پاکستان کو بہتر تصور فرماتے ہیں۔

سرکس منیجر۔ ہاں تو ابھی گیا نہیں البتہ راجستان میں میرے سرکس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۳) رپورٹر۔ گاندھی کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں۔

جوکر۔ مجھ میں ان کی نقل اس لئے نہیں اتارتا کہ کہیں مجھے سچ مچ کا برت نہ رکھنا پڑے۔ اور آپ [illegible]

اور محنت سے لفظ بہ لفظ ان کے جوابات لکھ رکھیں گے۔

خبریں۔ شہر کی انوکھی انوکھی خبریں اور تعجب خیز اطلاعیں جمع کرنے کا بیحد شوق ہو گا۔ خواہ وہ بے پر کی ہوں۔ بس ایک لفظ "غیر مصدقہ" لکھدیا اور رائی سے بڑی سے بڑی گپ ہانک دی اور بسا اوقات تو اس لفظ کے بغیر ہی چاہے جو لکھ ڈالیں یعنی ممکن ہے کہ کسی دن منحوس شہر میں اگر کوئی واردات، ہنگامہ یا حادثہ نہ ہو تو پھر کچھ خود ساختہ رپورٹیں ہی مرتب ہو جائیں ورنہ موسمی حالات پر ہی کھول کر شاعری کر ڈالی اور کالم کے کالم سیاہ ہو گئے۔ خبریں یا کچھ یوں ہونگی۔

"کل آٹھ بجکر ۱۶ منٹ ۳۲ سکنڈ پر ایک سانپ موسلی ندی سے نکل کر کنارے کنارے رینگنے لگا۔ ندی کنارے ہزاروں کا مجمع تھا۔ اور سب کی نظریں ۵۴ کا زاویہ بناتی ہوئیں سانپ پر جم گئی تھیں۔ گمان غالب ہے کہ سانپ پالی کا تھا۔ تحقیقات جاری ہیں تفصیلات کا انتظار کیجئے۔"

خوبی قسمت سے اگر کسی سیاسی جلسے یا کسی ادبی کانفرنس میں پہونچ گئے تو بس سیاست اور ادب پر وہ احسان عظیم فرمائیں گے کہ الامان! کچھ سیاسی اور ادبی خبریں نمونتاً پیش ہیں۔ "کل کے اجلاس میں تقریر فرماتے ہوتے جناح نے فرمایا میں اس پاکستان کو کبھی قبول نہیں کر سکتا اگر...... اس کے بعد ہی رپورٹر کے پنسل کی نوک ٹوٹ جاتا ہے اور لفظ "اگر" حذف کر کے یہ خبر یوں چھپ جائے گی "لیگ کی نئی پالیسی۔ محمد علی جناح کا پاکستان سے انحراف۔ کل کے اجلاس میں قائد اعظم نے پاکستان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا"
صادر کرنے مہاسبھا کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے فرمایا "میں بھی ہندو مسلم اتحاد چاہتا ہوں بشرطیکہ ---- پھر اکھنڈ ہندوستان کا نعرہ کوئی معنی نہیں رکھتا" درمیانی ایک جملہ کے چھوٹ جانے کے باوجود تسلسل بدستور قائم ہے۔ لہٰذا رپورٹ اس طرح شائع کیجا سکتی ہے "ساورکر ہندو مسلم اتحاد کیلئے بیحد کوشاں ہیں اکھنڈ ہندوستان کی آپ نے سرے سے مخالفت فرمائی۔"

"حیدرآباد کستوری بائی کا جلسہ تعزیت مقرر تھا۔ متواتر چار گھنٹے تک حیدرآباد کے سربرآوردہ لیڈروں نے تقریریں کیں۔ اور کستوری بائی زندہ باد کے نعروں پر جلسہ برخواست ہوا۔"

"بمبئی --- کل حضرت ماہر القادری نے ادبی کانفرنس میں تقریر فرماتے ہوئے کہا کہ میں ترقی پسند ادب اور بلینک ورس پر ایمان لاتا ہوں۔ اور فوراً آپ نے بعنوان "ٹوپی" ایک فی البدیہہ بلینک ورس سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ جب آپ اس مصرع پر پہونچے کہ "اغیار کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی ٹوپی" تو ہال داد و تحسین سے گونجنے لگا اور بغلبہ آراء پایا کہ اس مصرع میں آزادی ہند کیطرف اشارہ ہے۔"

جلسوں میں کاغذ کا پلندہ اور پنسل لے بیٹھتے ہیں کبھی تو ساری تقریر نقل کر ڈالی اور وہ بھی اس شان سے کہ پڑھنے بیٹھو تو مشکل سے دو چار بے ربط جملے پڑھ لئے جا سکیں یا پھر بیٹھے اونگھتے رہے، چونک کر اپنے جملوں کو لکھ لیا۔

جس پر مقرر نے زور دیکر گرجدار آواز میں کہا ہو۔ علاوہ
اس کے دوران تقریر میں پنسل بنائی جا رہی ہے۔ ربر
استعمال ہو رہا ہے۔ سر کی کھجلی اور جمائیوں کا تو شمار ہی نہیں
اس کے علاوہ غیر فطری اور اضولی باتوں
کو بھی بڑی دلچسپی سے جمع کیا جاتا ہے اور ان متحیر کن خبروں
سے عوام پر رعب گانٹھنے کی کوشش بھی فرمائی جاتی ہے
"مثلاً ٹلمنڈی ضلع چانڈور نگم۔ ایک بچہ جس کے
دو سر ہیں چھ ماہ قبل پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی صحت تا حال
برقرار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک منہ سے انگریزی اور دوسرے
سے اردو نہایت شستہ اور صاف بولتا ہے۔ البتہ ماہرین
ادب کی رائے ہے کہ اردو دلی در گمشدہ یاد و ماعد
انگریزی شکسپیر کے عہد کی بولتا ہے۔

یہ اور بیسیوں قسم کی خوبیاں ان انسان نما
ہستیوں میں جمع ہو جاتی ہیں "انسان نما" اس لئے کہ
میں ان افراد کو انسان سے زیادہ مشین سمجھتا ہوں جو ایک
ڈگر پر چل نکلتے ہیں اور بلا ارادہ ہی تا دم آخر انہی راہوں
پر بہے جاتے ہیں بس یہی دعا ہے کہ انھیں تھوڑی سی
عقل سلیم نصیب ہو جائے۔

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چُنیں ہے چناں پر

درد ہی اب تو زندگانی ہے۔
یہ تمہاری ہی مہربانی ہے۔
برق کا اضطراب کیا کہنا
حالتِ دل کی ترجمانی ہے
مستیاں۔ کیف۔ زندگی۔ نغمے
ہائے کیا عالمِ جوانی ہے۔
حوصلے دل کے بڑھتے جاتے ہیں
تیری نظروں کی مہربانی ہے
داغِ دل کو عزیز رکھتا ہوں
یہ کسی دوست کی نشانی ہے
قصۂ درد جب سنا تو کہا
ایک بھولی ہوئی کہانی ہے
یہ نوازش یہ التفات و کرم
اور بھی دل کو بدگمانی ہے
ہے یہ انجامِ کارِ عشق سلیم
میں ہوں اور سوزِ جاودانی ہے

امجد سلیم بغدادی

فریب

معین الدین خان انور طاہر

وینا ایک چھبیس سالہ جوان بیوہ تھی اگرچہ وہ حسن
کے تمام معیارات پہ پوری تو نہ اترتی تھی تاہم اس میں ایک
طرح کی دلکشی ہندو گھرانوں کی بوڑھی اور جوان بیواؤں کو
یکساں تارک الدنیا بنانے والی رسومات کے باوجود باقی تھی
بیضوی چہرہ سرخ و سپید رنگت اور لہراتی ہوئی
زلفیں ان سب نے ملکر اس کو بڑی حد تک حسن آرزو آموز
بنا دیا تھا۔ اس کے قد و خال کا حسن تناسب تو بس مصوروں
اور مجسمہ سازوں ہی کے تصور میں آسکتا ہے۔ ورنہ یوں
دیکھنے والوں کو صرف درمیانی قامت او چھریرے بدن کی
عورت نظر آتی تھی۔ مگر اس میں جو جاذبیت تھی اس سے
کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا۔

سامنے وہ ۔ وہ عظیم الشان عمارت نظر آرہی
ہے۔ اگر والوں کی ملکیت ہے یہ دو تین پشت گزرے اپنے
زمانے کے مشہور ذی ثروت زمیندار مانے جاتے تھے
مگر اب ان کی زمینداریاں وغیرہ قصہ و فسانہ بن گئیں
نے زندگی گذارنے کیلئے غیر معروف پیشے اختیار کر لیے ہیں
اور مکان اندر سے کئی ورثاء کے حصوں میں تقسیم ہے۔ یہی مقام
دراصل وہ اسٹیج ہے جہاں ایک پرشباب بیوہ کی زندگی
کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ عمارت کی ترخی ہوئی دیواریں گھر والوں
کی اندرونی نا اتفاقی اور افراتفری کا بزبان حال سے ماتم
کر رہی ہیں۔ مکان کے اندر بعض حصے او بعض حصوں کی نسبت کرتے
ذرا دور دور واقع ہوتے ہیں انھیں حصوں میں خاندان
کے اصلی وقار اور وسیع النظری جھلکیاں نظر آجایا کرتی ہیں جو
یادگار ہیں اسی بیتی ہوئی پرشکوہ ۔ دریا دل زندگی کی۔
ممکن ہے کہ کسی گھرانے کی دولتمندی کیساتھ اس کے
تمام مادی لوازم بھی غائب ہو جائیں لیکن انسانی دل
کی بعض خصوصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کا مادی مظاہر
کے ساتھ ہی مٹ جانا کسی طرح ممکن نہیں ہوتا اور وہ ایک
عرصہ دراز تک ان کی طبیعتوں میں اچھی رہتی ہیں۔
بالکل ایسے ہی جیسے کسی الماس انگشتری کا نشان اسکے
نکل جانے بعد بھی پہننے والے کی انگلی پہ ایک زمانہ دراز
تک برقرار رہتا ہے۔

عمارت کے ایک حصے پہ اب بھی ایک شریف
بڑھیا کا عمل دخل تھا۔ اس کی زمانہ دیدہ آنکھوں نے
خاندان کے اچھے دن بھی دیکھے تھے اور برے دن بھی
وہاں اس کی وہی عزت تھی جو کسی خاندان میں ضعیف العمر
وری کی ہو سکتی ہے۔ بڑھاپے نے اپنی پرانی عادتوں میں
کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ اس کی شعلہ زبانی کے پیچھے ایک
مہربان و رحم دل بھی چھپا ہوتا ہے۔ وہ آئے دن
کی فرمائشات سے اپنے پوتوں کیلئے نئی نئی مشکلات کا
باعث ہوا کرتی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے یہاں
خاندان کی بعض مصیبت زدہ بیواؤں کو پناہ دے

رکھی تھی۔ وینا بھی انہیں میں سے ایک تھی۔ خاندان کے ننھیال سے وینا کا دور کا رشتہ تھا۔ وہ پیرپور ضلع اناؤ کے ایک قریہ کی لڑکی تھی۔ اور پڑوسی گاؤں میں رشتہ کے ایک بڑے گھر میں بیاہ دی گئی تھی۔ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ وینا کے سہاگ کا زمانہ خوشگوار تھا یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کے سسرال روانہ ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد اس کا پتی پرلوک سدھارا۔ اس وقت وینا اکیسویں سال میں تھی۔ سنا ہے کہ شوہر کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے وہ حقوق سوگی تک مار دیئے گئے جن کی اکثر جوان عمر بیوائیں ان حالات میں مستحق ٹھرائی جاتی ہیں۔ وینا ایک کھوٹے سکے کی طرح اس کے بھائی کو واپس پھیر دی گئی۔ مگر بھائی صاحب ایسے تھے کہ انہوں نے تمام عمر اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

اس وقت خاندان کی اسی بوڑھی دادی نے وینا پر ترس کھا کر اسکو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اگرچہ کہ یہ سہارا بھی کچھ یوں ہی سا تھا۔ پر وینا کھلے آسمان تلے تو نہ رہی (و) روٹا جھوٹا کھانا بھی پو پھٹے سے لیکر رات گئے تک کام میں جتی رہنے اور ہر وقت بڑھیا کی ناز برداریاں کرنے سے ملنے تو لگا تھا۔ دوسری بیوائیں وینا کو ان کے کھانے کپڑے میں زیادہ کی حصہ دار پا کر جلتی تھیں۔ وینا نے ان کے جلاپے کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنے اصولوں پہ ہنس بول کر چلتی رہی۔ وہ ہر وقت بوڑھی دادی کی پوری محنت اور توجہ سے خدمت کیا کرتی۔ اس نے مکان کے دوسرے کنبے والی عورتوں سے بھی دوستی پیدا کر لی تھی۔ اور جب کبھی موقع ہاتھ آتا تو ان کی اور ان کے بچوں وغیرہ تک کی خدمت سے کبھی نہ چوکتی۔ اس کی قبول صورتی سے اس کو کبھی نہ تھکنے والی مسکراہٹ ملی تھی جبکا اس نے فائدہ اٹھایا اور سب پہ فوقیت حاصل کر لی۔

ایک دن جب وہ بوڑھی دادی کے پیر داب رہی تھی کہ کوئی جوان عمر مرد کمرے میں داخل ہوا۔ اور بے تکلف انداز میں بڑھیا کی مزاج پرسی کرتے ہوئے بستر کے قریب آ بیٹھا۔ وینا نے نسوانی فطرت کے تقاضے سے ساری درست کر لی۔ اور گھونگھٹ کھینچ لیا۔ بوڑھی دادی وینا کو محجوب پا کر ہنسنے لگی۔ کہا۔ تجھے یوں بھی نہ لجانا چاہیئے لڑکی۔ یہ تو ہمارا سورن ہے میرے بھائی کا پوترا۔ جا اس کے لئے مٹھائی اور پان لیتی آ۔ جب وینا اٹھنے لگی تو اس نے محسوس کیا کسی کی بھوکی بھوکی نظریں اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی ہیں اس نے پلکیں اٹھائی ہی تھیں کہ دونوں کی نظریں لڑ گئیں۔

اس سے پہلے سورن کبھی کبھی ہی آیا کرتا ہوگا۔ اب اس کا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ وہ جب کبھی آتا بوڑھی دادی وینا کو آواز دے کر سورن کا کوئی نہ کوئی کام سپرد کر ہی دیتی اس طرح دونوں کے درمیان شرم و تکلف کی جو برفیلی چٹان سی حائل تھی۔ وہ پگھلنی شروع ہوئی دن گزرتے گئے اور دونوں کے درمیان راست گفتگو بڑھتی گئی اب سورن زیادہ دیر دیر تک بیٹھنے لگا تھا اور وینا بھی دادی کے قریب گھنٹوں مصروف رہنے لگی تھی اگرچہ سورن دنیا بھر کی باتیں کیا کرتا مگر اب بھی شرمیلی

وینا "ہاں" اور "نہیں" سے زیادہ نہ کہہ سکتی تھی۔ لوگوں سے بھرا ہوا گھر انہیں زیادہ کھل کر ملنے اور بولنے سے روکتا تھا۔

ایک رات جب وینا نے اپنا تھکن سے بوجھل سر تکیہ پر رکھا ہی تھا کہ نیچے کوئی کاغذ جیسی شئے کھڑکھڑائی حیرت کہ تکیہ کے نیچے ایک خط رکھا ہوا تھا جیسے وینا نے لوگوں کی نظروں کے خوف سے فوراً چھپا دیا اور بڑی رات گئے سب کے سو جانے پر خط کھول کر پڑھا۔ سورن نے محبت کا اظہار کیا تھا۔ وینا اس قدر جھلائی کہ خط کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ رات کا باقی حصہ اپنی حالت پہ آنسو بہانے اور طرح طرح کی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔

ایک بار جو خطوط کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی طرح رک نہ سکا۔ ہر رات وینا کو ایک خط تکیے کے نیچے رکھا ہوا ضرور مل جاتا۔ آئے دن سورن کی نہ مٹنے والی گہری محبت کے تقاضے ترقی پر تھے۔ آخر کب تک۔ وینا بھی اپنی موجودہ خادمانہ حیثیت اور سورن کی امید بندھاتی ہوئی آئندہ کی مکمل مسرور زندگی کا موازنہ کرنے لگی۔ اس نے ایک بار سورن کو جواب میں خط لکھ ہی دیا کہ "وہ بار بار خط کے ذریعہ ان ہونی باتوں کا لالچ دینے سے باز رہے" وینا نے خط بذات خود موقع پاکر ڈاک کے ڈبے میں ڈالا۔ اسے امید تھی کہ آئندہ یہ خط بتدریج بند ہو جائیں گے اور یہ رونگٹے کھڑے کرنے والا کھیل اب ختم ہی ہو جائیگا

لیکن اثر الٹا ہوا یعنی اب تو سورن نے اپنے پریم سندیسوں کا تانتا ہی باندھ دیا۔ اس کے خط طویل سے طویل ہوتے گئے۔ ادھر وینا کی پر تکلف تحریروں میں بھی اشتیاق کروٹیں لینے لگا۔ اس کے لئے اب یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ ان خطوط کو جو ہر وقت اس کی کرتی میں چھپے رہتے تلف کر دیتی۔ وینا جوں جوں رام ہو چلی تھی اسی نسبت سے سورن کی جراءت اظہار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ دن بھی آخر آ ہی گیا جب سورن کا آخری اور ناقابل انکار خط ملا جس میں لکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک ایسے دور دراز مقام کو نکل چلے جہاں ان کے کھل کھیلنے میں کوئی روک نہ ہو۔ اور وہ باہم ایک نئی دنیا بسا لیں۔ سورن نے آتی رات کو چمن کے سایہ دار گوشہ میں آ کر اس کے انتظار میں ٹھیر لینے تہیہ کیا تھا۔ لکھا تھا کہ جب تم آ جاؤ گی تو ہم دونوں ریلوے کے قریب اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔ اور یہیں سے ہماری آزاد زندگی کی ابتدا ہو گی۔

خط پڑھتے ہی ذہنی اضطراب سے وینا کو بخار سا آ گیا۔ ایک طرف آزادی محبت یا غیر تشفی یافتہ جذبات تھے اور دوسری طرف ایک غیر یقینی انجام یا ایک تاریکی سی جس کے وار پار کوئی انسانی نظر کام نہیں کر سکتی۔ کوئی قوت اس کو آگے دھکیلتی تھی اور پھر اس کو اپنی خود حفاظتی جبلت اس کو پیچھے گھسیٹ لیجاتی۔ اس کا دل

خوف و ہراس سے تیز تیز جنبش کر رہا تھا مگر اسی کے ساتھ ایک بے پایاں مسرت کا احساس بھی دل میں انگڑائیاں لیتا ہوا جاگ رہا تھا۔ وینا کے آنسو رات بھر سیلاب مسلسل بنے رہے۔ امید اور ناامیدی خوف اور جرات کی اس کشاکش نے اس کو صبح ہونے ہونے تک آدھ موا سا کر دیا۔ پرسکون حالت میں رہنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وینا نے معمولی معمولی سے کاموں میں بھی غلطیاں کیں۔ اس کا چہرہ سرخ بھبوکا ہو رہا تھا۔ اور قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔

غرض یہ نتیجہ خیز دن ختم ہونے ہوتے اس کا بچار اور بچار کیسا تفکر بڑھتا گیا۔ اس کی نگاہ میں سورین کے آخری خط کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ خط کا ایک ایک لفظ اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا۔ اس کے باوجود ابھی تک کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ سکی تھی مگر جب بوڑھی دادی کے کمرے میں سورین کی آواز سنائی دی تو اس کی رہی سہی جھجک بھی جاتی رہی اور جس وقت سورین نے آنکھ کے اشارے سے دریافت کیا کیا وہ چل رہی ہے تو وینا بھی اس بات میں سر کو آہستہ سے جنبش دیتی ہوئی کمرے میں بھاگ آئی اس کا جسم آس اور یاس کی آخری کشمکش سے دو دو کر رہا تھا۔

بہرحال اَن ہونی بات ہو گئی۔

رات کا بڑا حصہ کٹ چکا تھا۔ اور پورا گھر نیند میں مدہوش تھا۔ باہر چمن کے تاریک گوشہ کی طرف ایک گاڑی سہجے سہجے بڑھ رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی آنکھیں کسی گہرے اشتیاق سے چمک رہی تھیں اُدھر اس بڑے مکان میں کوئی جوان عورت سہجے سہجے قدموں سے مکان کا تاریک صحن لانبے لانبے برآمدے طے کرتی آرہی تھی۔ آخر وہ پچھلے دروازے پر آہی گئی۔

سورین نے وینا کو اپنی آغوش شوق میں بھینچ لیا اور اپنے بیتابانہ پرشوق بوسوں سے اسکا استقبال کیا۔ وینا خود کو سکتہ کی سی حالت میں پا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم باز۔ ہونٹ۔ کھلے شہد یا کس معصیت سے تپے جا رہے تھے۔ وینا میں کچھ شرم تھی۔ اور کچھ فرحت و مسرت۔ چند لمحے تو وہ اپنے آپ کو سپرد کئے رہی اور کوئی مرد اسکی حسین صورت پر بوسے دا اعتبار ہا۔ مگر جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو اس نے دیکھا کہ وہ سورین کے بازوؤں میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے۔ اور کوئی نوکدار سی شئے اس کی پسلیوں میں رہ رہ کر چبھ رہی ہے چاہا کہ خود کو اس کے بازوؤں سے آزاد کر لے لیکن سورین نے وینا کی اس کوشش کو پشیمانی سمجھتے ہوئے اپنی گرفت مضبوط کر لی اور وہ نوکدار چیز وینا کو پہلے سے زیادہ چبھنے لگی۔

" دیکھئے آپ کی جیب میں کوئی چیز مجھے چبھ رہی ہے۔ وینا نے سرگوشی کی " اوہ۔ وہ کھلونے۔ میں تو بھول ہی گیا۔ " سورین نے ہنس کر کہا۔ وینا متحیر رہ گئی "کھلونے؟ یہاں کیوں؟

"بچوں کیلئے خریدے تھے" سورین کا جواب تھا
آج کی مصروفیات میں انہیں دینا ہی بھول گیا"

"بچے؟ کس کے بچے؟" وینا فوراً پرے ہٹ گئی۔

"بچے! اور کس کے ہونگے وہ — میرے ہی تو ہیں!

"کیا — ؟ تم بیاہے ہوئے ہو؟ اور تمہارے بچے بھی ہیں پھر تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہا" وینا کی جیسے چیخ نکل گئی۔

ہاں! میرے مگر وہ ہمارا کیا لیتے ہیں وینا! مجھے اپنی بیوی سے محبت نہیں وہ سرد مہر ہے اس سے میری طبیعت نہیں ملتی تمہارے ساتھ میں پھر سے ایک نیا جیون بنانے والا ہوں۔ یہاں سے دور — بہت دور ہم اس سے بھی کہیں اچھا ایک آنند بھون بسالیں گے جہاں تم میری پریت کی چھاؤں میں سندر سپن جیسے دن بتایا کروگی۔ سورین نے وہی الفاظ دہرائے جو اس نے کتنی ہی مرتبہ اپنے خطوط میں لکھ مارے تھے۔

چونکی ہوئی وینا اب گاڑی کی اندرونی نشست پر نہ رہی تھی۔ "کشور — ہٹ مار بڑی!" وہ آنسو بہاتی ہوئی چلائی۔ مجھے ابھی واپس لے چل یا نہیں تو میں دہائی مچاتی ہوں ابھی اتنا سمنے ہے۔ کہ میں کس کو نظر آئے بنا گھر چلی جاؤنگی

"سورین گھبرایا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے وینا کو بھلا پھسلا کر اپنی راہ پر لگانا چاہا کہا کہ — سچ پوچھو تو نہ میری کوئی بیوی ہے نہ بچے یونہی تجھ سے مشغول کیا تھا"
مگر بپھری ہوئی وینا اس کے نئے جھانسے میں آ نہ سکی

آخر مجبوراً سورین کو گاڑی چمن کی طرف لوٹانا ہی پڑی
دینا گاڑی سے کود کر دیکھے بغیر بھاگ نکلی

صبح کو اس کی نعش کھیل کے میدان میں جھولوں کے اونچے ستون سے لٹک رہی تھی۔ میں نے جب اس کا ہلکا پھلکا مختصر سا سرد لاشہ پھانسی کے پھندے سے آزاد کیا تو اس کی کرتی سے بہت سے گرد آلود دمڑی پائے ہوئے خطوط بازی گاہ کی سبز گھاس پہ گر کر بکھر گئے۔

تبصرہ

آئندہ اشاعت میں کیا جائیگا۔

خانقاہ　　ایم۔ اسلم　　—　عبدالحق اکاڈیمی
کنول　　اعظم کریوی　　"
سادہ و رنگین افسانے　۔　ظفر قریشی　　"

اور
دوسری کتابیں

مضامین نگار

حضرات مضامین صاف اور خوش خط لکھا کریں۔ اس سے اغلاط کا احتمال نہیں رہتا۔

ناظم

جاہل

صفی الدین صدیقی

لیڈی ڈاکٹر اور گریجویٹ خواتین سے تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اپنے کنبے اور اس سے باہر ملنے جلنے والوں کی لڑکیوں کو میں ہمیشہ ہی مشورے دیتا آرہا ہوں کہ وہ بھول کر بھی ایک لیڈی ڈاکٹر بننے کی فکر نہ کریں خواہ مخواہ ناک میں دم آجاتا ہے۔ ان سے جدھر دیکھو دوائیوں اور بیماریوں پر لکچر دیئے جا رہے ہیں گھر اچھا خاصا دواخانہ بن جاتا ہے۔ اگر کوئی بیمار نہیں بھی ہے۔ تو خواہ مخواہ بنا دیا جاتا ہے۔

لیکن ایک گریجویٹ خاتون سے تو کسی معنوں میں بھی مفر نہیں اس مشینی دور میں عورتیں بھی بیداری کے نغمے گانے لگی ہیں۔ گھر کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کے کاروبار میں شرکت کرنے کا شوق ہوگیا ہے۔ دفتروں میں وہ ہیں کہ گھسی آرہی ہیں سیاسی معاملات میں مردوں کے مقابل وہ نظر آئیں گی۔ ایسے تمام امور اپنے سر لینا چاہتی ہیں جن کی اُن سے کبھی امید ہی نہ کی جاسکتی تھی

اُدھر دو چار روز سے گھر میں یہ شور مچا ہوا تھا کہ سردی کی ان چھٹیوں میں کوئی گریجویٹ خاتون تشریف لا رہی ہیں۔ ان کی لیاقت، انکی غیر معمولی پڑھائی، ان سب کے چرچے بڑے شد و مد کے ساتھ ہو رہے تھے۔

میں نے فوراً اپنی حیثیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں شاید عمر اور پڑھائی دونوں باتوں میں ان سے کچھ کم ہی تھا۔ لیکن پتہ نہیں یہ تنہائی پسند لوگ مجھے کیوں ایک آنکھ نہیں بھاتے، ہمیشہ منہ بسور کر رہنے والوں پر تو مجھے انتہائی غصہ آتا ہے۔

یہ معلوم کر کے کہ وہ کچھ اسی قسم کی خاتون ہیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی یقین ہوگیا کہ ہم دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ فطرتوں کے اقتضا کے بموجب ہمارے درمیان ہر وقت جھڑپ سی رہا کرے گی وہ رونا چاہئیں گی میں اپنے شیطانی قہقہوں سے تمام گھر کو سر پر اٹھا لونگا وہ خاموش رہنا پسند کریں گی میں اتنا زیادہ شور مچاؤں گا کہ قیامت بھی پناہ مانگنے لگے۔ وہ خوب جھنجلائیں گی۔ غصہ سے لال پیلی ہوں گی۔ اور کچھ عجب نہیں آخر میں ان کی زبان سے میرے حق میں بد دعاؤں کی بوچھاڑ شروع ہوجائے۔

سنا تھا کہ وہ ہوسٹل میں رہتی ہیں ان کی شخصیت اور ان کی طبیعت نے مجھے تھوڑی دیر کیلئے زنانہ ہوسٹل کی زندگی سے بھی واقف کرا دیا۔ پھر مجھے اپنے ہوسٹل کی رنگین و دلکش زندگی یاد آگئی۔ اس کے پرکیف ماحول میں رہنے کے بعد شاید ہی کوئی اداس ہوتا ہو۔

ڈے اسکالرس یعنی غیر مقیمین میں قنوطی قسم کے طلباء پائے جاتے ہوں تو ہوں۔ لیکن کم از کم ہمارا ہوسٹل تو اس لعنت سے آزاد ہے۔ یہاں کا ہر ایک مقیم ایک بہت بڑا

(OPTIMIST) ہے جو ہمیشہ اپنے مستقبل کی درخشانی
کے سنہرے خواب دیکھا کرتا ہے۔

زنانہ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی اور ماحول کا
تو مجھے صحیح صحیح پتہ نہیں لیکن متذکرہ بالا محترمہ کی شخصیت
سے اس کا راز کھل جاتا ہے کہ وہاں پر شاید ہر وقت
موت کی سی خاموشی طاری رہتی ہے۔ ہر کوئی اپنے
اپنے کمروں میں سند موٹی موٹی کتابوں کا دور کرنے
میں مصروف ہوتی ہو گی۔

ہاں عورتیں جو ہوئی، نظامِ تعلیم کو درہم برہم
کرنے والیاں، بی، اے، ایم، اے، ایم، ایس، سی
ان کی نام کے ساتھ یہ ڈگریاں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں،
ان کا لجی عطیوں کا تصور انہیں کچھ مغرور ساہی جانے
پر مجبور کرتا ہے۔ سمجھنے لگتی ہیں کہ علم کے بحرِ بیکراں کا ساحل
پالیا، لیکن شاید انہیں اس بات کا پتہ نہ ہو کہ اس
سمندر کا ساحل ہی نہیں ہوتا اور جیت اسی، مانجھی
کی ہوتی ہے جو جان بوجھ کر اپنی "ناؤ گرداب کے
سپرد کر دیتا ہے۔

شاعرِ مشرق نے ایک طالب علم سے کتنی
بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے۔
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں مگر صاحبِ کتاب نہیں۔

"تعلیمِ نسواں" کا مسئلہ ایک عرصے سے زیرِ بحث
رہا ہے لیکن ابھی تک کسی نے اس کا خاطر خواہ حل
نہیں پیش کیا۔

لڑکیوں کو تعلیم دلوانا بہت خوب ہے کیونکہ
کسی قوم کی قسمت کو سنوارنے میں ان کا بہت بڑا
ہاتھ ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کی آغوش میں ایک
بہترین قوم پرورش پاتی ہے لیکن کیا یہ ایسی تعلیم حاصل
کرنا گوارا کر سکتی ہیں جو انہیں اس اٹل حقیقت سے
کہ وہ ایک عورت ہیں۔ قدرت کا ایک بیش بہا عطیہ،
کہیں دور، دوسری دنیا میں بے جا کر پھینک دے۔

آپا زہرہ کا ہاسٹل سے گھر پر عنزول ہوا۔ وہ تو
واقعی کچھ قنوطی قسم کی نکلیں۔ آنکھوں پر دو عدد موٹے
موٹے شیشوں کا تسلط تصور سے زیادہ پڑھنے والی،
جیسے پڑھنا ہی تو عورت کی زندگی کا راز ہے۔ اور
پھر غضب خدا کا آپا زہرہ نے۔ ایم۔ ایس۔ سی میں
کمسٹری" لے رکھا ہے۔ ادب یا اور کوئی مضمون لے لیتیں۔
تو ایک بات بھی تھی۔ وہ ادب لینے سے انہیں کم از کم
اس بات کا تو اندازہ ہو جاتا کہ اُن کی اور اُن کی
ہم جنسوں کی زندگیوں کی دنیا والوں کے نزدیک کیا
قیمت ہے۔

نہیں معلوم ہو جاتا کہ اس بزمِ جہاں کی
رونق کس کے دم سے ہے، یہ پھول آخر کس کے لئے
مسکراتے ہیں۔ یہ شام کی رنگینیاں اور صبح کا سحر

کس کے واسطے ہے۔

اور سب سے زیادہ یہ دنیا بھر کے شاعروں نے شعر کس کی تعریف و توصیف میں کہے ہیں۔

لیکن ان کے دماغ پر تو دنیا کو فتح کرنے کا جنون سوار تھا۔ کہنے لگیں۔

کیا دنیا مادام کیوری کی سائنسی خدمات کو بھلا سکتی ہے۔

لیکن نہ جانے مجھے کیمسٹری وغیرہ سے کیوں خواہ مخواہ نفرت سی ہے۔ "اس" میں "وہ" ملا کر "وہ" بنا لیا" دو گیسوں کو ملا کر ہوا، پانی، ترشیہ نہ جانے کیا الم غلم تیار کر دیا جاتا ہے۔ آخر اس سے کچھ فائدہ بھی تو ہو۔

آپا زہرہ نے جھلا کر کہا۔

"تم جاہل ہو جاہل۔ دراصل تم میں ابھی اتنی سمجھ ہی نہیں پیدا ہوئی کہ تم سائنس کی اہمیت کو جان سکو" جواب دیا۔

تو جناب میں کیا اس مضمون کا منکر ہوں، لیکن کیا یہ دنیا بھر کے مرد مر گئے ہیں جو یہ مصیبت آپ کے سر آن پڑی ہوئی ہیں۔

"جاہل ہو۔ (وہ غصے میں آ کر یہ کسی کو اسی خوبصورت خطاب سے یاد فرماتی ہیں) اچھا جاؤ اب میرا دماغ نہ چاٹو، مجھے بہت پڑھنا ہے۔

بس آپا ایک اور بات سن لیجئے، ایک قصہ سنئے

ایک مولوی صاحب نے اپنی صاحبزادی بلند اقبال کو خوب پڑھایا اور وہ ان کو چاہتے بھی بہت تھے سب بے چارے کے لڑکے تو بڑے جاہل نکلے، لے دے کے نام و شہرت کی امید انہیں ایک صاحبزادی سے رہ گئی تھی۔ آخر کب تک جیتے، دوسری دنیا کو سدھارنے کا قصد کیا، وقت آخر انہوں نے اپنی عالم صاحبزادی سے پانی مانگا بجائے اس کے کہ صاحبزادی صاحبہ صراحی میں سے پانی لائیں اپنی چھوٹی موٹی لیباٹری میں پہونچکر آکسیجن اور ہائیڈروجن ملا کر پانی تیار کرنے میں لگ گئیں اور ادھر والد صاحب قبلہ مرحوم ہو گئے۔

آپ مجھے مارنے کیلئے قلم اٹھایا۔ اور میں اپنی شامت آئی دیکھکر وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ انہوں نے کھٹ سے دروازہ بند کیا اور حسب دستور پڑھنے کیلئے بیٹھ گئیں

ادھر مجھکو ضد ہو گئی کہ میں انہیں تنگ کر کے رہونگا اور اتنا زیادہ کہ آخر میں وہ خود اس مضمون کی برائیاں اپنی ہی زبان سے کرنے لگیں۔

ایک روز وہ ضرورت سے زیادہ پڑھنے پر تل گئیں میں پہنچ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو انہوں نے صبر و سکون سے کام لینے کی کوشش کی، آخر جب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو بہ آواز بلند فرمانے لگیں۔

دیکھتے نہیں اسٹڈی ہو رہی ہے۔ یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ، اگر اس طرح ڈسٹرب کرو گے تو۔

ابھی وہ یہ جملہ مکمل کر ہی رہی تھیں کہ میں بول اٹھا۔

آپ خواہ مخواہ یہ انگریزی الفاظ کیوں ٹھونسے جا رہی
ہیں ۔ ہم کو آپ کی انگریزی دانی کا اعتراف ہے لیکن یہاں ان
کی جگہ اچھے سے پیارے اردو الفاظ استعمال نہیں کئے جا سکتے
اسی لئے تو کہتا ہوں کہ یہ سائنس وغیرہ کے گورکھ دھندوں
کو خیرباد کہو ۔

غصہ سے ان کا چہرہ لال ہو گیا ۔ نہیں معلوم کتنا
لاینحل جملہ کہنے کی ٹھانی تھی انہوں نے منہ سے فقط اتنا نکل
کر رہ گیا ۔

"جاہل"

شکریہ ۔ لیکن آج میں نے دماغ کے متعلق چند
باتیں پڑی ہیں اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت
ہی کچھ زیادہ "جاہل" ہے ۔

"وہ کیسے"

وہ ایسے ۔ یعنی ایک ماہر عضویات کی یہی رائے
ہے کہ ۔ ثباتِ عقل کی حالت میں اب تک جتنے دماغوں
کا وزن کیا گیا اُن میں مرد کے سب سے بھاری دماغ کا
وزن ۹۶ ر ۰۷ اونس اور سب سے ہلکے کا ۳۴ اونس ثابت
ہوا بحساب اوسط مرد کے دماغ کا وزن ½ ۴۹ اونس ہے
عورت کا سب سے بھاری دماغ اب تک ½ ۶۱
اونس اور سب سے ہلکا ۳۱ اونس نکلا بحساب اوسط عورت
کے دماغ کا وزن ۴۴ اونس ہے جیسے ان کے غرور و تمکنت
کو دھکا سا لگا ۔ بولیں ۔

"یہ سب بکواس ہے"

گویا یہ ساری دنیا کے ماہرین عضویات Physiologist
کو اُلو بناتی ہوئی فرمانے لگیں ؛

"اگر دماغ کے وزن سے کسی شخص کے عاقل ہونے پر
دلالت نکلتی ہے تو یہ بھی ایک تجربہ ہے کہ فلاں دھوبی کے فلاں
سمجھدار گدھے کا وزن کیا گیا اور اس کا وزن ۹۱،۵۶۰۸۷،۹
اونس کے قریب نکلا ۔"

"لیکن جناب میں تو آپ کو اُن تمام ماہرین عضویات کے
کے ناموں سے واقف کرا سکتا ہوں جنہوں نے دماغ کے
متعلق معلومات فراہم کرنے میں اپنی عمروں کے بہترین حصوں
کو ضائع کر دیا پتہ نہیں یہ آپ کے ماہرین عضویات کس ملک
میں اور کس قوم میں پیدا ہوئے ہیں"

میرے یہ روز روز کے حملوں نے اُن پر خوشگوار
اثر کیا ۔ اب ہر مذاق کا وہ مسکرا کر جواب دینے لگیں یعنی اپنے
مضمون کی نوعیت جتلانے کا جو انہیں خبط ہو گیا تھا وہ تھوڑا
بہت جاتا رہا ۔

ایک دن ہار مانتی ہوئی فرمانے لگیں ۔

" ہاں میں نے بڑی غلطی کی جو یہ مضمون لیا لیکن
بھیا وقت تو کافی سے زیادہ گزر چکا اب پچھتانے سے فائدہ
اگر یہی رائے ایک آدھ سال پہلے دیتے تو کچھ بات تھی
اب تو میں مجبور ہوں ۔ اپنا وقت اور روپیہ برباد کرنے
سے تو رہی ۔

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آخر انہوں نے
میرے کہے کو تو تسلیم کر لیا ۔ ورنہ کیا مجال تھی جو وہ دوسروں
کی باتوں پر کان تک دھرتیں ۔

چند ہی دنوں بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ پہلے سے

بھی زیادہ انہماک کے ساتھ پڑھنے کیلئے آپا زہرہ نے مجھسے جھوٹ موٹ صلح کرلی تھی ۔ اور صلح کی شرائط کو مانتی ہوئی اپنے مضمون کی دل سے نہیں تو زبان سے ضرور مذمت کی تھی ۔ لیکن پھر بھی انہیں لگاؤ رہا اُسی شیطانی مضمون سے ۔

ایک سال بعد اُن کے نام کیساتھ ایم ایس سی لکھا جانے لگا ۔ چاروں طرف ان کی لیاقت وقابلیت کے چرچے تھے ۔

زنانہ کالج نے بخوشی ایک معقول مشاہرہ پر ان کی خدمت کو اپنے لئے حاصل کرلیا ۔ اب وہ سائنس کی ایک بہترین لکچرار سمجھی جاتی ہیں ۔

اس واقعہ کے بعد میں نے پھر اپنی حیثیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی درحقیقت کی تو میری ہی طرف نظر آئی معلومات بحث مباحثے کی حد تک تو میں اب بھی ان سے کہیں زیادہ "عالم" کہلایا جاسکتا ہوں ۔ لیکن "ملازمت" کے معاملے میں تو "جاہل" ہی ہوں کیونکہ زمانہ ابھی عورت کی قدر کرنا نہیں بھولا ہے ۔

فی الوقت تو آپا زہرہ کی حیثیت مسلم ہے لیکن ایک طرف سے مجھے بڑا اطمینان ہے اور اس بات کا کامل یقین ہے کہ اپنی زندگی میں ایک نہ ایک مرتبہ وہ ضرور ہارینگی ۔ نہایت ہی شاندار پیمانہ پر اور وہ ہار ایسی رہا ہوگی جس کے تلے اُن کے ماضی کی تمام جیتیں دب کر رہ جائیں گی ۔

وہ ہے "شادی"

کیوں کہ ـــــ

"شادی ایک جوا ہے جس میں ہار ہمیشہ عورت کی ہوتی ہے ۔"

واردات

آکہ اک ہنگامۂ محشر نیا برپا کریں
آکہ اس دنیا میں اک دنیا نئی پیدا کریں

آکہ حسنِ بے وفا کو عشق کا شیدا کریں
اور رسوائی کا اس کی کوبکو چرچا کریں

مدتیں گزریں چراغِ آرزو خاموش ہے
آکہ پھر یادِ کہن تازا کریں

آکہ دشتِ عشق خالی ہے جنونِ قیس سے
سعیٔ پیہم سے نشانِ قیس پھر پیدا کریں

حسن کے پندارِ باطل کو جنون سے توڑ دیں
آکہ سازِ زندگی میں پھر نوا پیدا کریں

آپلٹ دیں کائناتِ زندگانی کا نظام
آکہ بازارِ جنون میں عقل کو رسوا کریں

(رچائیون)
مظفر حسین شمیم

قال زبان

ڈاکٹر حمید الدین صدیقی

لیکن قبل اس کے ہم دخل در معقولات کریں دیکھا کہ چند کنسٹیبل جو بیش پیش تھے میدان چھوڑ گئے۔ اور ہر ایک سے باہر نکل آئے۔ اور اُن کیا تھا ہی ان کے پیرو ان کے بھی پیر اکھڑ گئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو چند صاحبان الماریوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کو بھی جنبش ہوئی۔ اور گارڈ صاحب نے اپنی جیب سے کچھ نکال اُن کو تقسیم کرنا شروع کیا۔ اور وہ بھی ایک ایک کرکے باہر آ گئے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گارڈ صاحب نے کچھ پریشانی ٹیکس وصول کرکے ان لوگوں کو جگہ دی تھی۔ لیکن ٹیکس دہندہ ان کو دیکھکر جب۔ اور لوگ بھی آ گئے۔ اور انہوں نے ٹیکس کے خلاف احتجاج کیا۔ تو گارڈ صاحب نے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا۔ بصد یاس حرمان ٹیکس واپس کر دیا

مثل ہے جو بندہ یا سندہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک ڈبے کے سامنے پہونچے تو دیکھا کہ ایک ڈبے میں دو صاحب سامان گاہوں پر بستر جمائے نہایت اطمینان سے سو رہے ہیں۔ اور وہ پولیس مین اور ایک سیٹ پر ایک صاحب نہایت لحیم شحیم و دراز ہیں۔ لوگ جلدی جلدی اس ڈبے میں گھسنے لگے اس ڈبے کی شانِ نزول یہ تھی کہ اصل میں ڈبہ برف کا تھا۔ حضرات پولیس تو ہر جگہ مداخلت بے جا کا حق رکھتے ہی ہیں۔ ان تین صاحبوں نے علاوہ ٹکٹوں کے کچھ مزید رقم ان حضرات پولیس و برف والے کو دے کر استمراری پٹہ حاصل کر لیا۔ اب

ہم جو پہونچے تو ہم نے استمراری پٹہ والے صاحب سے مودبانہ عرض کیا کہ جناب اتو چھوبج رہے ہیں۔ ذرا اُٹھکر بیٹھ جائیے دوسروں کو بھی بیٹھنے دیجئے۔ بخدا ہمنے مودبانہ ہی عرض کیا تھا۔ لیکن جواب ملا کہ "یہ نہیں اُٹھتے"۔ ہم نے پھر عرض کیا۔ جناب یہ تھرڈ کلاس ہے۔ اٹھکر بیٹھئے۔ آخر ہم کہاں بیٹھیں۔ جواب ملا جہاں جی چاہے بیٹھو نہیں اُٹھتے آپ جانئیے کہ اجازت ملنے کی دیر تھی۔ اور پھر جبکہ اجازت میں ہمکو اختیار کلی بھی تفویض تھا۔ ہم نہایت متانت سے جیسے کبھی کبھی شکار میں کسی ناہموار پتھر پر بیٹھکر شکار کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان حضرت کے سر اقدس پر بیٹھ گئے اب تو مجبوراً تھوڑا سا کھسک کر جگہ تو دیدی لیکن لگے لڑانے ہم نے پولیس مین صاحب سے عرض کیا۔ کہ حضرت اب آپ ہی اٹھئے۔ ان کی ڈیوٹی بھی انکو یاد دلائی۔ مگر وہ اٹھے تو نہیں لیکن معلوم نہیں ان کا کچھوے سے کیا تعلق تھا۔ کہ سمٹ کر دیوار سے ایسے چپٹے کہ دو تین آدمی ان کو پشت دے کر بیٹھ گئے۔ لیکن ہمارے کرمفرما کا غالباً مینڈک سے وہی تعلق تھا۔ جو کانسٹیبل کا کچھوے سے۔ کہ کسی طرح ٹرانا بند نہیں ہوتا۔ مجبوراً ہم نے عرض کیا۔ اب آپ کو اٹھا ہی دیا جائے۔ اکڑ کر بولے دیکھیں کیسے اٹھاتے ہو۔ اب تو ہماری رگوں میں خون ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اور نہایت جوش کیساتھ ہم اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہونچے۔ ان سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بے چارے

کچھ ضرورت سے زیادہ نیک واقع ہوئے تھے۔ فرمانے لگے
کہ اب صبح تو ہو ہی گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ خود ہی اُٹھ جائینگے
لیکن یہ منطق ہماری سمجھ میں کہاں آتی جب ہم نے دیکھا کہ
اسٹیشن ماسٹر صاحب کسی طرح اپنی ہماری سننے کیلئے تیار
نہیں تو ہم فوراً زنانہ ڈبے کے پاس پہونچے۔ ٹائپ رائٹر
اور فائل کیس۔ لیکر سیدھے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر
میں پہونچکر ان کے میز پر ٹائپ رکھا۔ اور ایک اپنا مراسلہ کا مطبوعہ فارم ٹائپ
رائٹر پر چڑھایا۔ اب ذرا اسٹیشن ماسٹر صاحب چونکے کہنے لگے آپ یہ کیا کر رہے ہیں
میں نے کہا۔ ایک مراسلہ ٹائپ کر کے آپ کو دیتا ہوں اور مثنیٰ
گارڈ کو۔ مضمون یہ ہوگا۔ کہ ایک شخص خلاف قانون پورے ڈبے
پر قابض ہیں۔ آپ کو زبانی رپورٹ کی آپ توجہ نہیں کرتے
لہذا یہ تحریری رپورٹ کیجاتی ہے اگر آپ فوری انتظام نہیں
کرتے تو ہم خود انتظام کر لینگے اور اگر اسمیں کشت و خون کی نوبت آ گئی
تو اُس کے ذمہ دار آپ ہونگے۔ ہمارا اسونٹا ہمارے پاس رکھا ہوا تھا۔ اب تو
اسٹیشن ماسٹر صاحب گھبرائے۔ گارڈ کی تلاش ہوئی بریک دیکھے بکنگ روم دیکھا پاخانہ
دیکھا۔ پلیٹ فارم پر جھاڑو دیکر کوڑا جمع کر کے چھانا۔ لیکن
گارڈ صاحب ندارد۔ ہم بھی تنگ۔ دو دو میں سیکنڈ گارڈ صاحب
آ گئے۔ اسٹیشن ماسٹر معاملہ اُن کے سپرد کیا۔ انہوں نے آکر
جگہ کرائی۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ خدا خدا کر کے آٹھ بجے صبح راستہ
صاف ہوا گاڑی چلی۔ بلہار شاہ پہونچنے تک کوئی بات پیش نہ آئی
بجز اسکے کہ گرم پانی کی فرمائش ہوئی۔ اور ہمارا ایثار حسن
کارگذاری سے مستفید ہونیکی ایک مسلمان خاتون ہماری بیگم
صاحبہ کے توسط سے متمنی ہوئیں ہم نے بخوشی منظور کیا اور

برتن لیکر چائے والے کے پاس پہونچے۔ لیکن وہاں فوجی محافظ
قائم تھا شنوائی نہ ہوئی۔ ہم انجن کے پاس پہونچے۔ فائرمین
صاحب نے پانی کھولا۔ ہم پانی دونوں ہاتھوں سے لے رہے
تھے۔ انجن کو نداق جو سوجھا۔ انہوں نے چھینک لی۔ اور
اور وہ کھولتا ہوا پانی ہمارے ہاتھوں کو سیراب
کر گیا۔ لیکن داد دیجئے ہماری ہمت کی۔ کہ پانی کا برتن ہاتھ
سے نہ چھوڑا۔ پانی لاکر دیا اور اپنے اہلہ دستی کے مزے
لینے لگے۔ تیز گاڑی چلی اور تیزی سے مسافت طے
کرتی ہوئی قاضی پیٹھ پہونچی۔ یہاں زنانی گاڑی تبدیل
کرنی پڑی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی گاڑی تو حیدرآباد
جانے والی نہیں لیکن صرف یہی تین ڈبے ایک انجن لگا کر بھجوا دئے
جائینگے۔ بحمد شکر ادا کیا لیکن اب وقت یہ کہ یہ ڈبہ
تحریک بے پردگی کے حامی اور ہماری بیگم صاحبہ کٹر پردہ
دار لیکن مجبوری کو کیا کریں مردانی گاڑی میں بٹھایا
ڈیڑھ روپیہ قلی صاحب کی نذر کرنا پڑا۔ کچھ اور بھی پردہ
دار عورتیں تھیں۔ اسی ڈبہ میں ایک سکھ فوجی نوجوان
مع اپنی بیوی اور ایک ڈیڑھ سالہ بچے کے بیٹھے تھے اُن
کا بچہ نہایت بے تکلف واقع ہوا تھا۔ فوراً بلا کسی وجہ
موجہ کے ہم سے اختلاط فرمانے لگے۔ ایک تو ہم یونہی
بچوں کے دلدادہ پھر ہنس مکھ۔ چلبلا اور بے تکلف
بچہ ہمک ہمک کر اگر کسی کی طرف لپکے تو شاید ہی کوئی ایسا
سنگ دل ہو گا اس سے مخاطب نہ ہو۔ ہم بھی متوجہ
ہو گئے۔ اور گود میں لے لیا۔ لیکن اب مصیبت یہ تھی

کہ ہماری یہ حرکت ہماری نواسی صاحبہ کو سخت ناگوار ہوئی لیکن ہم بڑے جہاندیدہ ہم نے دونوں کو خوش رکھا۔

قاضی پیٹھ سے روانہ ہونیکے بعد خیال تھا کہ مصائب ختم ہوگئے لیکن سکندرآباد پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی ترکش میں ایک تیر باقی اور ہے گاڑی سکندرآباد پہونچی وہاں اترنے والے مسافر اتر گئے۔ صرف حیدرآباد جانے والے باقی رہے ہم نہایت اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ایک مرتبہ پھر حکم ملا کہ گاڑی خالی کیجئے۔ ارے بھائی کیوں ہم تو حیدرآباد جائینگے۔ فرمایا کہ ہاں یہ گاڑی نہیں جائیگی۔ بلکہ سامنے والی گاڑی جو دہلی جانے والی ہے یہ حیدرآباد جاکر واپس آئے گی لہذا اس پر جائیے۔ قہر درویش بر جان درویش اترے قلی بلایا اس گاڑی پہ بیٹھے ڈیڑھ قلی کی مزدوری کی شکل میں جرمانہ بھگتا اور بجائے آنے والی کے جانے والی گاڑی پر صبح ۷ بجے کے بجائے شام کو ۷ بجے حیدرآباد پہونچے۔

”دل کیلئے ہے اذنِ خرابی“

رنگ ارغوانی چہرہ کتابی
یا شمعِ روشن اور جلوہ تابی

چہرہ پہ زلفیں، زلفوں میں چہرہ
یہ پردہ داری یہ بے حجابی

وہ مست آنکھیں وہ انکی مستی
کچھ ہوشیاری کچھ نیم خوابی

گر چشمِ ساقی کردے اشارا
ہوجائے ساری دنیا شرابی

نظروں میں شانِ معجز نمائی
آنکھوں کو شوقِ حاضر جوابی

سر پہ تصدق ہر سربلندی
قدموں پہ صدقے گردوں رکابی

جانِ مجسم، روحِ مصور
اللہ اکبر یہ لاجوابی

شیریں تکلم روشن تبسم
انداز سادہ عارض گلابی

ہر گام پر وہ مستانہ لغزش
دل کے لئے ہے اذن خرابی

اے دل مبارک اے جان مبارک
یہ بزم جاناں اور باریابی

اے جذبۂ دل اب تیری قسمت
ناکامیابی یا کامیابی

رہے عشقِ عالم فیضانِ فطرت
دولت نہیں ہے یہ اکتسابی

عالم فخری

تعلیم و تربیت

مرزا سیف علی خان

تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ایسے انسان پیدا کئے جائیں جو اپنی زندگی کی تنظیم عقل کی روشنی میں صحیح اصول پر کرسکیں۔ ان کے ارادے بلند اور عزم راسخ ہوں، زندگی زندگی کی مشکلوں اور الجھنوں سے وہ نہ گھبرائیں۔ بلکہ انہیں اپنی کوششوں اور تدبیروں سے سلجھانے کی فکر کریں۔

ہماری سوسائٹی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار بار تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور اس مسئلہ پر کثرت سے اظہار خیال بھی ہوتا رہتا ہے مگر کوئی عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے لئے ایک افسانہ رنگیں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہر باپ اور ہر ماں کا یہی دعوی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کرتے ہیں مگر ان کی تعلیم و تربیت کے نتائج پر اگر غور کیا جائے تو صفر ہی صفر نظر آتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے کہ اس زمانے میں جو داغ بیل ڈالی جاتی ہے اسی پر مستقبل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے مگر ہمارے گھروں میں یہ کام ایسے لوگوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو ہر طرح

خشت اول چوں نہد معمار کج

کا مصداق ہوتے ہیں۔ ننھی ٹہنیوں کو جدہر موڑ دیا جائے وہ اسی طرف کو بڑھتی ہیں، اسی طرح چھوٹی عمر میں جس رخ پر ان کے ماحول کا اثر بچوں کے کردار اور ان کی ذہنیتوں کو پھیر دیتا ہے۔ اسی طرف ان کے رجحان کا قائم رہنا ایک فطری بات ہوتی ہے۔ اس لئے پوری کوشش کرنی چاہئیے۔ کہ شروع سے درخت سیدھا اور ٹھیک رہے۔

ماں کی گود بچے کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے۔ ہر ماں کو چاہئیے کہ خود اپنے بچہ کی دایہ بنے۔ ماں بننے سے پہلے ہر عورت کا فرض ہے۔ کہ آنیوالی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کی اہلیت خود میں پیدا کرے ورنہ اس کے لئے بے اولاد ہی رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کی اولاد ہو اور وہ بری ہو۔

چار سال کی عمر تک بچے کا ماں کی چوکس نگرانی میں تربیت پانا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس عمر میں بچہ کے عام رجحانات کا مرکز زیادہ تر ماں ہوتی ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ماں بچے کے دل و دماغ میں اچھے جذبات اور سیدھے رجحانات کی تخم ریزی کر سکتی ہے۔ یہ اس طرح ہو کہ بچہ پر بار نہ گذرے۔ تعلیم و تربیت کے طریقوں کو آسان اور سادہ بنانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ ایک کم

قابلیت ماں ہی اپنے بچہ کی اچھی پرداخت کر سکے۔

عورت کا حصہ اولاد کی ابتدائی تربیت میں بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ ہے۔ بچہ کی تربیت ماں کی گود میں پہلے ہی روز سے شروع ہو جاتی ہے، تربیت کا زمانہ اسی وقت شروع ہو جاتا ہے۔ جب کہ بچہ شیر خوار ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں اس کی ہر قوت کی نشو و نما کا آغاز ہوتا ہے۔ باپ کو اس دور سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ بچے کے اخلاق و عادات کو سنوارنے اور اس کے مستقبل کو شاندار بنانے والی زیادہ تر ماں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اس کو جو کچھ سکھایا جائے وہ پتھر کے نقش کی طرح اس کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتا ہے اور عمر بھر اس کے اعمال و افعال اور حرکات سے ظاہر ہوتا رہتا ہے بچے کی خوش نصیبی یا بد بختی اس کے اخلاق و کردار کی تعمیر یا تہذیب ماں کی صحیح تعلیم و تربیت پر منحصر ہے، ماں کی مثال اس کوزہ گر کی سی ہے۔ جو مٹی کو جو وضع چاہتا ہے دیتا ہے۔

ماں کے اثرات بچوں پر بدرجہ اتم مترتب ہوتے ہیں اور یہی وہ بنیادی نقوش ہیں جو کسی بچے کی لوح دماغ پر کندہ ہو کر ہمیشہ کے لئے باقی رہتے ہیں ماں بچے کے کردار کی معمار اولین ہوتی ہے اور مقام ماں کی گود ہی ہو سکتا ہے جہاں کسی بچے کے کردار اور ذہنیت کی اچھی یا بری بنیاد پڑتی ہے۔ ایک نا اہل ماں اپنی اولاد کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں ماں بننا کوئی ہنر یا خوبی نہیں ہے، البتہ ماں کے فرائض حقیقی معنوں میں انجام دینا بیشک ہنر ہے! اور بہت بڑا ہنر!!

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر روز ولٹ کی بیوی کے چند تاثرات جو انہوں نے اپنی صنف کے فرائض کے متعلق اپنی سوانح عمری میں لکھتی ہیں۔ اختصار کے ساتھ پیش کئے جائیں۔

لوگ خیال کرتے ہیں کہ مجھکو سیاسیات سے بہت دلچسپی ہے مگر مجھکو اپنے گھر سے زیادہ کبھی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوئی، میں ایک عورت کی انتہائی عظمت اسی میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایک "اچھی بیوی" اور "اچھی ماں" ثابت ہو، ایک عورت اچھی ماں بن کر ہی نئی نسلوں کی تربیت کر سکتی ہے اور انہیں پروان چڑھا سکتی ہے میرے خیال میں یہی سب سے بڑی سیاسی اور قومی خدمت ہو سکتی ہے۔ عورت کا حقیقی حسن اس کی آرائش و زیبائش اور ظاہری نمائش میں نہیں ہے بلکہ عورت کی اصل خوبصورتی اس کا بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار ہے ہم دنیا میں مقدس ہستیوں کی اس لئے قدر نہیں کرتے کہ وہ "خوبصورت" تھیں! بلکہ اس لئے قدر کرتے ہیں کہ ان کے باطنی اوصاف اس درجہ بلند تھے کہ وہ آج بھی ہمارے لئے باعث تقلید ہیں!!

سب سے زیادہ روحانی مسرت مجھے جس چیز سے حاصل ہوتی ہے وہ میرے شوہر کی خدمت ہے! میں اپنے

شوہر کی خدمت کرنا اپنا اولین فرض اور باعث فخر سمجھتی ہوں۔ میں اپنے گھر میں امریکہ کے پریسیڈنٹ کی بیوی بن کر نہیں رہتی بلکہ ایک معمولی شہری کی طرح زندگی بسر کرتی ہوں، ہر امیر اور غریب عورت کی زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ وہ "عورت" بن کر رہے۔ اور اپنے فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کرے ہماری بہنیں اپنے فرائض کو بھولتی جا رہی ہیں، وہ ایک نئی "دنیا" بنانے کی فکر میں ہیں۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کرتی کہ ایک عورت نسوانی دائرے سے نکل کر مردوں کی نقالی کرنے لگے، ہم کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لیتے ہوئے بھی اپنی "نسوانیت" اور نسوانی خصوصیات کو برقرار رکھنا چاہیئے یہی چیز ہمارے لئے باعث فخر اور ابدی سکون کا سبب ہو سکتی ہے۔"

یہ خیالات ایک ایسی خاتون کے ہیں جو "نئی دنیا" کی آزاد فضا میں پیدا ہونے کے بعد بھی نسوانی فرائض کی اس حد تک پابند ہے۔ کہ "اپنے شوہر کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین" اور باعث فخر سمجھتی ہے! اس خاتون کی ماں قابل تحسین ہے کہ اپنی لڑکی کی ایسی صحیح تعلیم و تربیت کی کہ آج وہ حقیقی معنوں میں ایک بہترین "بیوی" اور قابل ترین "ماں" ہونے کا فخر کر سکتی ہے۔

جو شخص اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت صحیح اصول پر نہیں کرتا وہ نہ صرف اپنی لڑکی پر ستم کرتا ہے۔ بلکہ پوری نسل اور قوم کی بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی جاہل لڑکی اپنی طرح اپنی اولاد کو بھی کندۂ ناتراش ہی رکھے گی۔ نہ اس کی صحیح تربیت کر سکے گی نہ اس کا کردار بنا سکے گی اور یہ سلسلہ یونہی دراز ہوتا جائے گا۔

غزل

ہر اشک یاس ہمدم ہے جان آرزو کی
تصویر حسرت دل بوندیں مرے لہو کی

مٹ مٹ کے بن رہی ہے دنیائے دل خدایا
بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

سب باعث محبت سب کارسازی دل!
اک خواب زندگی کا ہر شکل آرزو کی

عہد وفا سے پہلے اے کاش! ہم سمجھتے
مشکل تھی نظر کی حسرت کی جستجو کی

احساس نامرادی اے کاش تو نہ ہوتا
دامان دل کو حاجت ہر وقت ہے رفو کی!

"ہستم قمر منکر" (ہمایوں)

مشاہدات

سید نیاز حیدر ناکام

میں شانِ کریمی کی طرف دیکھ رہا ہوں
انسان کو کشکول بکف دیکھ رہا ہوں

آئین و عدالت کا کرم دیکھ رہا ہوں
پاکیزگی دیر و حرم دیکھ رہا ہوں

زر دار کو مصروفِ طرب دیکھ رہا ہوں
دنیا کی تباہی کا سبب دیکھ رہا ہوں

تہذیب و تمدن کا اثر دیکھ رہا ہوں
شائستگی فکر و نظر دیکھ رہا ہوں

آزادی ملت کے طلب گار کو دیکھا
حاکم کے نمک خوار و فادار کو دیکھا

مقروض و مہاجن کے بھی کردار کو دیکھا
انسان سمجھ کر سگِ خونخوار کو دیکھا

کیا صاف نظر آتی ہے اللہ کی قدرت
آئینۂ انسان میں شیطان کی صورت

آجائے کسی سمت سے طوفانِ الٰہی
حسرت ہے کہ دیکھوں تری دنیا کی تباہی

ارم

ادارہ ارم حیدرآباد دکن

قیمت ۸ر آنے

ماہنامہ

جدید ادبی رجحانات کا آئینہ دار

اِرَم

دی۔بہمن ۱۳۵۴ف

م

نومبر۔دسمبر ۱۹۴۴ء

خط و کتابت و ترسیل زر دفتر ماہنامہ ارم روبرو نامپلی ہائی اسکول نامپلی روڈ

صدر دفتر سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد دکن۔

چندہ

سالانہ — چار روپیہ
ششماہی — دو روپیہ آٹھ آنہ
فی پرچہ — ۸ ؍

ادارت

ارشاد محمد خان آزاد بی ۔ ایس ۔ سی (علیگ)
سید راشد حجازی

دفتر

روبرو نامپلی ہائی اسکول نامپلی روڈ
حیدر آباد دکن

جلد ۵ — شمارہ ۳

فہرست مضامین ماہ دی بہمن ۱۳۵۴ف م نومبر ۔ دسمبر ۱۹۴۴ء

ایک خط

تین ماہ قبل کا پرچہ میری نظر سے گذرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعض نامعلوم اسباب سے متاثر ہو کر اپنی پالیسی میں تبدیلی کا ارادہ کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا یہ اقدام کہاں تک صحیح ہے۔

ہاں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ایسے پرانے لکھنے والوں سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ جو ترقی پسندی کے غلط خیال کے زیر اثر کثیف اور عریان ادب کو پیش کرتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ترقی پسندی انتہا پسندی بھی ہے ــــ ادب کو ماحول اور اس کی کثافتوں سے متصل کرنا ادب کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ ادب اسوقت تک ادب کہلانے کا مستحق ہے۔ جب تک کہ اس میں زبان کی لطافتیں ہوں ــ خواہ مخواہ کے غیر ضروری ماحولی مسائل کو ادب میں بھر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا آپ اسی کو ترقی پسند ادب کہتے ہیں جسکے پس پشت سعادت حسن منٹو۔ عصمت چغتائی ــ اور دیگر اسی قسم کے لوگ ہیں۔ ایسے ہی ادب کی آپ ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ یقیناً آپ کی تبدیلی قابل ملامت ہے۔ اگر آپ اسی قسم کا تخیل اپنے دماغ کے کسی کونے میں بھی رکھتے ہیں۔

اردو زبان کو اس وقت اس کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ نئے لکھنے والے پیدا ہوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ صاحبان فراخدلی سے مبتدیوں کی حوصلہ افزائی کریں۔ آج اگر وہ حسن و عشق کی داستانیں لکھتے ہیں۔ تو کل ان سے بہتر لکھنے کی امید ہے۔ ایسے ادیبوں سے بہر حال بہتر ہیں جو عریاں پسندی کو ترقی پسندی کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ ترقی پسندی کے موقتی جذبے سے متاثر ہو کر مبتدیوں کے مضامین کو ردی میں ڈال دیں تو اس کا نتیجہ لازماً۔ انکی ہمت شکنی ہوگا۔ جو زبان کیلئے نقصان عظیم کے مترادف ہے۔

میرے خیال میں تو ہندوستان کے دیگر پرچوں کو بھی یہی اصول اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ وہ نئے لکھنے والوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کریں۔ لیکن ایسا ہو بھی کس طرح سکتا ہے۔ جن دماغوں میں ترقی پسندانہ جراثیم بس چکے ہوں ان سے اس قسم کی امیدیں تشنہ ہی رہا کرتی ہیں۔

میرا اپنا نظریہ ہے۔ (بعض اوقات تو میں اسے سو فیصد کامیاب نظریہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں)۔ کہ نیا ادب" یا ترقی پسند ادب بجائے خود کوئی اپنے میں جامعیت نہیں رکھتا؟ بلکہ بعض انسانی نفسیاتی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے اڈیٹروں اور ادیبوں نے جذبات انگیز جملیات کے تسلسل کو ترقی پسندی کا نام دیدیا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے جو اس خیال کے صحیح ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ کہ نفسیات کے اس پہلو کی پہچان کے بعد انہوں نے کافی سے زیادہ فائدہ حاصل کیا ہے۔ ان کی بلا سے اخلاق پہ اثر برا ہو یا اس کے برعکس۔ انہیں تو اپنے فائدہ سے کام ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے مضامین میں فرسودگی اور کہنگی ہے۔ وہ لکھتے وقت ماحول کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ تو کیا غالبؔ۔ میرؔ۔ مومنؔ سب کے سب

غلطی پر تھے؟ یا ان کے دماغوں میں حالات کے سمجھنے کی صلاحیت
نہ تھی۔ جو انہوں نے پہاڑی دوشیزاؤں کے جسم سنگین اور مزدور
عورتوں کی ساقین اسود کو اپنے اشعار میں جگہ دی ——
میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ترقی پسندانہ ماحول سے الگ
رہ کر حسب سابق اپنا کام انجام دیجئے۔ میں پھر عرض کرونگا
کہ ہر زبان کا ادب زبان کی لطافتوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور
اہل زبان کی شائستگی کا آئینہ دار۔
ماحول کی کثافتیں ان لطافتوں کو پامال کر دیتی ہیں۔ ادب
کو اسکے اپنے مقام پر رکھئے۔ اور مسائل حاضرہ کو ان کی
اپنی جگہ پر۔ یہ اس لئے کہ متلاشیانِ علم کو جو سکون دائرہ
ادب میں آکر ملتا ہے۔ وہ صرف ادب کی لطافت اور انفرادیت
کی وجہ سے ہے۔ گرد و پیش کے مکدر کن مناظر کے خاکے ایک
طرف تو متعلمین پر بار گذرتے ہیں۔ دوسرے ادب کو اس
کے صحیح اور مناسب مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔

ایک خادم ادب

جواب خط

"خادم ادب" صاحب نے اپنے طویل خط میں جو اعتراضات
کئے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ اس قدر ناقابل فہم نہ تھے
کہ انہیں خط لکھنے میں اپنا وقت ضائع کرنا پڑتا۔ مگر لفظ اعتراض
کیساتھ ہی ہمارے دماغ میں ایک ناگہانی پیدا ہونے والے
جذبہ کا خیال آجاتا ہے۔ جو ہمیں کسی چیز کے توصیفی پہلو سے
بیگانہ کر دیتا ہے۔ ورنہ اگر ہم کسی چیز کے ہر پہلو کو بنظر تعمق
دیکھ لیں اور اپنے دماغ ہی سے اعتراض کا جواب مانگیں تو ہمیں
مایوسی نہ ہوگی۔ مگر ایسا ہوا نہیں کرتا۔ یا ہوتا ہے تو کم از کم
دماغ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہی
صورت ہمارے خادم ادب صاحب کے اعتراض کی ہے۔
انہوں نے ہمارے اداریہ کا پہلا پیراگراف پڑھا ہوگا۔ چونکہ وہ
کسی نہ معلوم وجہ کی بنا پر ارتقائی ادب سے چوکنے معلوم ہوتے
ہیں۔ فوراً ہی انہوں نے باقی اداریہ کو تو الگ کیا اور اعتراض
کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے خط کی عبارت کے الجھاؤ
سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں کتنا غور کیا ہوگا۔

ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ہم نے نوخیز انشاء
پردازوں کی حوصلہ افزائی سے دست کشی اختیار کر کے
بڑی بھاری غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیوں کہ وہ ایسے
لوگوں سے بہت اچھے ہیں جو ترقی پسند ہیں اور عریاں
لکھتے ہیں۔ ترقی پسند ہونا اور عریاں لکھنا یا عریاں لکھنا
اور ترقی پسند ہونا۔ اس کا جواب ہم بعد دینگے ——
معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خادم ادب صاحب نے ہمارا
اداریہ پورا نہیں پڑا۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے ——
انہوں نے پہلا پیراگراف پڑھتے ہی اپنے دماغ میں ایک ہیجانی
کیفیت پیدا کر لی۔ اور ان کی نظر میں ہماری نوخیز انشاء
پردازوں سے دست کشی ایک مسلمہ بات ہو گئی ——

ان کو اس سے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا یا پھر موقع تھا۔ مگر انہوں نے غور ہی نہیں کیا۔ اگر وہ ہمارے اداریہ کے آخری حصے کو پڑھ لیتے تو غالباً انہیں اسقدر طویل خط لکھنے کی زحمت گوارہ نہ فرمانی پڑتی

ہم نے یہ عرض کیا تھا کہ دو سال تک متواتر موقعہ دینے کے باوجود ہمیں اپنے مقصد میں پوری کامیابی نہ ہوئی۔ لکھنے والوں کی زیادہ تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے۔ جن کے رجحانات دوسری قسم کے ہیں۔ مگر موقتی جذبے سے متاثر ہوکر وہ اپنے مضامین شائع کرانے کے متمنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے جذبہ کے زیر اثر لکھا ہوا مضمون افسانہ یا غزل کہاں تک بہتر ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے نئے لکھنے والوں کی پیداوار ہمارے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے ہمارے اداریہ کا آخری پیراگراف جس سے ہمارے نظریہ کی تشریح بھی ہو جاتی ہے اور اعتراض کا جواب بھی۔

ہم ان لکھنے والوں کے درخشاں مستقبل کے متمنی ہیں لہذا ان سے خواست گار ہیں کہ وہ ہمیں عشقیہ افسانے اور فضول قسم کی غزلیں نہ بھیجا کریں وہ کوئی تحقیقی مضمون یا تنقیدی ہمارے پاس بھیجیں تو ہم اولین اشاعت میں اسے جگہ دینگے۔ لیکن افسانوں اور غزلوں کیلئے صفحات خالی نہیں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عشق والفت کی داستانیں نتیجتہً سماج کی کسی ایک کمزوری کی آئینہ دار تو ہو سکتی ہیں۔ مگر ملک کے نوجوانوں کے لئے ان کا درخشاں مستقبل بنانے کا سبب نہیں بن سکتیں یہ یاد رہے کہ ہم صرف اسی نوعیت کے لکھے ہوئے افسانوں اور غزلوں کے مخالف ہیں۔ نہ کہ ترقیاتی غزلوں اور اصلاحی افسانوں کے

(باقی۔ باقی)

جنگ اور اسکے قواعد

قیصر عثمانی ۔ بی ۔ اے (عثمانیہ)

ابتدائے آفرینش سے انسان بالطبع جنگجو واقع ہوا ہے۔ اس بحث کی ابتدا حضرت آدم کی اولاد ہابیل اور قابیل سے ہوئی ہے دنیا کے بڑے بڑے سیاستدان اور مدبرین اتبک اس دھن میں سرگرداں ہیں کہ کسی صورت سے جنگ کا دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر گذشتہ جنگ عظیم کے فوری ختم پر مجلس بین الاقوام کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر چونکہ اس مجلس کے پیچھے مجلس کی کوئی فوجی طاقت نہ تھی جو اراکین انجمن سے اس کو بنائے ہوئے ضابطوں کی پابندی کرواتی اس لئے یہ انجمن اپنی مقاصد میں ناکام رہی اور اب ہم ایک دوسری عظیم تر جنگ کی ہولناکیوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ اس جنگ کے کامیاب اختتام پر متحدین کی جانب سے جو "نظام نو" قائم کیا جانے والا ہے۔ اگر وہ درحقیقت دنیا کی تمام مظلوم اقوام کی آئندہ سلامتی اور آزادانہ ترقی مکمل آزادی اور معاشی حیات کی ضمانت دے تو ہمیں قوی امید ہے کہ دنیا کو آئے دن ایسے وحشیانہ مظالم سے ایک طویل مدت کیلئے چھٹکارا ملیگا۔

جب جنگ دنیا کے لئے ایک ضروری برائی بن گئی ہے۔ تو اس کے بدترین اثرات کو کم کرنے کیلئے اور متحاربین کو دوران جنگ میں باوجود ان کے مخاصمانہ عزائم کے ایک دوسرے کیساتھ انسانی سلوک کرنے کے لئے چند قواعد بھی مرتب کئے گئے ہیں۔ جنکی حیثیت محض رواج کی سی ہے۔ اور ان قواعد پر صرف اسی وقت عمل ہوتا ہے جبکہ مابین باہمی رضامندی سے ان پر بپابندی عمل کریں۔ ان قواعد پر عمل کرنے سے فریقین جنگ کو مساوی فایدہ پہنچتا ہے اس لئے عام طور پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔

مخاصمانہ کارروائیاں

کشیدگی تعلقات کی ہر صورت کو ہم جنگ نہیں کہہ سکتے۔ آئے دن ہم ایسے مخاصمانہ افعال کے متعلق کچھ نہ کچھ سنتے رہتے ہیں۔ جو جنگ سے کم درجہ کے ہیں مگر یہ دوستانہ تعلقات بھی نہیں کہے جا سکتے۔ مثلاً کسی ملک کا ایک دوسرے ملک کی اشیاء درآمد پر غیر معمولی محصول بڑھا دینا یا دوسرے چند ممالک کے مقابلہ میں کسی ایک خاص ملک کو اپنی مملکت میں غیر معمولی تجارتی مراعات دینا وغیرہ

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات ایسے غیر دوستانہ تعلقات اس قدر شدید ہو جاتے ہیں کہ ان کا ناگزیر نتیجہ جنگ کی صورت میں نکل آتا ہے۔ عموماً ایسی صورت میں دو ملک دھمکی یا دباؤ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقصد حاصل ہونے پر یہ تعلقات پھر اصلی حالت کی طرف عود کر آتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے "محدود جنگی تدابیر" بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ دو ایسی سلطنتوں میں جو پُرامن ہیں اگر کشیدگی ہو جائے۔ تو صرف گولی چلانے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور جنگ کے تمام ذرایع استعمال نہیں کئے جاتے ۱۹۲۶ء میں جبکہ اسپین میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ اسپین میں جرمنی کے ایک تجارتی جہاز کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اس کے جواب میں جرمنی کے جنگی ہوائی جہازوں نے اسپین کے ایک بندرگاہ پر دو گھنٹے بمباری کی اس سے مقصد صرف انتقام اور آئندہ

کارروائیوں کا انسداد تھا۔

جہاز روکنا۔ (EMBARGo) اگر ہم کو کسی ملک سے شکایت ہے اور ہمارے ملک کی بندرگاہ میں اس ملک کے جہاز لنگر انداز ہوں تو ان شکایتوں کی تلافی تک اس ملک کے جہازوں کو روک رکھتے ہیں۔ یا سمندر میں ان کا محاصرہ کر لیتے ہیں تاکہ وہ نہ جا سکیں۔

ناکہ بندی (BLOCKADE) زمانۂ قدیم میں اس اصطلاح کا مفہوم بالکل مختلف تھا۔ ابتداء میں انتقام کا منشاء یہ تھا کہ ایک ملک کی رعایا اپنے ہمسایہ ملک میں کوئی جرم کرے تو متاثر ملک کو یہ حق حاصل تھا کہ دوسرے کسی شخص کو جس کا تعلق مرتکب جرم رعایا کے ملک سے ہے اس کو روک رکھا جائے یا اس کا مال ضبط کر لیا جائے تاوقتیکہ شکایت رفع نہ ہو مگر اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بجائے متضرر ملک تجارتی تعلقات منقطع کر لیتا ہے۔ اور بعض اوقات معاشی دباؤ سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ آسٹریا کے جرمن الحاق سے قبل ۱۹۳۳ء میں ان دونوں ممالک میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ آسٹریا یورپ کا ایک اچھا سرمائی مقام سمجھا جاتا ہے۔ تمام یورپ سے سیاح جاڑوں میں آسٹریا جاتے ہیں اور آسٹریا کو ان سیاحوں سے ایک معقول آمدنی ہوتی ہے۔ آسٹریا جانے کا راستہ جرمنی ہو کر گذرتا ہے۔ اسلئے جرمنی نے سیاحوں کے پروانہ راہداری کے محصول میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تاکہ بہت سیاح آسٹریا جا سکیں اس سے آسٹریا کی حکومت کو معاشی نقصان پہونچا۔

مذکورہ بالا واقعات کے اظہار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ سب مخاصمانہ تعلقات کا اظہار ہیں۔ ان کو جنگ نہیں کہا جا سکتا تو پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ جنگ کسے کہتے ہیں؟۔

جنگ کی تعریف | مسٹر لارنس (LAWRENCE) کا خیال ہے کہ سرکاری فوجوں کا نیت اور ارادہ کیساتھ دوسرے ملک پر مخاصمانہ کارروائیوں کا آغاز کرنا۔ اس سے منشا یہ ہوتا ہے کہ تاختم جنگ پرامن تعلقات کو توڑ دیا جائے۔" سرکاری فوجوں کی کارروائی سے مقصد یہ ہے کہ فریق ثانی سے اپنی مرضی منوائی جائے۔

ایک عرب مولف سرخسی نے جنگ کی یہ تعریف کی ہے۔

"خدا کی راہ میں مالی، جسمانی، زبانی اور ہر طرح کی کوشش عمل میں لانا" سرخسی کی تعریف اسلامی تصور سے متاثر ہے اپنے آپ کی حفاظت کرنا درحقیقت خدا کی راہ میں جنگ کرنا ہے یہ خدا تعالیٰ کی مرضی کی تعمیل ہے۔ سرخسی کی تعریف موجودہ جنگ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ چونکہ اس جنگ میں اتحادی اقوام کے تمام مادی اور روحانی وسائل حرکت میں آگئے ہیں۔ موجودہ جنگ کو جیتنے کیلئے متحدین نے نہ صرف انسانی اور میکانکی قوت سے مدد لی ہے۔ بلکہ اخبارات ریڈیو سے کام لینے کے علاوہ عاجلانہ فتح کیلئے وقتاً فوقتاً کلیسا اور معابد میں دعاؤں کا بھی انتظام کیا ہے۔"

اعلان جنگ | جنگ میں اعلان جنگ پہلی چیز ہے ہیگ کانفرنس نے یہ قرار دیا ہے کہ جنگ شروع کرنے سے پیشتر

جس ملک سے جنگ کرنی ہو اسکو اس کی اطلاع دیجانی چاہیئے مگر لارڈ برکن ہیڈ سابق وزیر ہند کی رائے ہے کہ ایک سو پچاس سال کے اندر جس قدر بھی جنگیں ہوئیں اور جن کا اندازہ تین سو کیا جاتا ہے ۔ اس میں سے صرف چار میں اعلان جنگ ہوئے ۔

موجودہ جنگ میں جب جرمنی نے یکم ستمبر ۱۹۳۹ء پولینڈ پر دھاوا بول دیا تو انگلستان نے جرمنی کو جنگی الٹی میٹم بھیجا اور جواب کے لئے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی اور فرانس نے بھی انگلستان کی تقلید کی جواب کے نہ آنے پر مسٹر چمبرلین نے وقت مقررہ کے ختم پر پارلیمان انگلستان میں جنگ کا اعلان کیا۔ جاپان نے اس جنگی قاعدہ کی کوئی پابندی نہیں کی بلکہ اچانک امریکہ کے خلاف پرل ہاربر پر حملہ کر دیا اور انگلستان کے جہاز پرنس آف ویلز اور ریپلس کو بحر ہند میں اچانک بمباری کر کے ڈبو دیا ۔

اٹلی اور یونان کی حالیہ جنگ میں اٹلی نے الٹی میٹم کی رسماً پابندی کی ۔ یونان کے پایۂ تخت ایتھنز میں اطالوی سفیر نے یونانی وزیر خارجہ کو رات کے ۳ بجے اٹھایا اور اس کو یہ معلوم کرایا کہ سوا گھنٹے کے بعد دونوں ممالک برسر جنگ متصور ہونگے ۔

صرف دو صورتوں میں، اعلان جنگ کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی

(ا) مدافعتی جنگ (ب) انتقامی جنگ

اپنی مدافعت میں جنگ کرنا قانون فطرت کے عین مطابق ہے ۔ اجتماعی حیثیت سے یا انفرادی طور سے کسی پر حملہ ہو تو اس کا جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے ۔ اور انتقام میں دشمن کو نقصان پہونچا کر کارروائی روک دی جاتی ہے ۔ اس لئے اعلان جنگ کی ضرورت نہیں ۔

جنگ شروع ہونے کے اثرات :- جنگ شروع ہوتے ہی فریقین کو حقوق حربیت حاصل ہو جاتے ہیں ۔ بعض اثرات فوری ہوتے ہیں اور بعض دوران جنگ میں جاری رہتے ہیں ۔

جنگ کے فوری اثرات :- سفارتی تعلقات ختم کر دئے جاتے ہیں ۔ اگر کشیدگی کے زمانہ میں سفیر واپس نہ بلائے گئے ہوں تو جنگ چھڑتے ہی ہر ملک اپنے سفیر کو واپس بلا لیتا ہے ۔ اور دوسرے سفیر کو امن سے واپس جانے دیتا ہے ۔ اور سفیر کو اپنے عملے کے سرحد پار حفاظت کے ساتھ پہونچایا جاتا ہے مگر جرمنی نے موجودہ جنگ میں بعض نامعلوم اسباب کی بنا انگریزی سفیر کو عمداً جرمن سرحد پر اس وقت تک روک رکھا ۔ جب تک کہ جرمن سفیر انگلستان سے ہالینڈ (ہالینڈ اس وقت ایک غیر جانبدار ملک تھا) کی سرحد پر نہ پہونچا ۔ اور ہالینڈ میں دونوں سفیروں کا تبادلہ عمل میں آیا ۔ جنگ چھڑتے ہی فریقین جنگ کے زمانہ امن کے معاہدے خود بخود معطل ہو جاتے ہیں ۔ دشمن کی رعایا کو برسر جنگ ملک میں کسی قسم کے تجارتی کاروبار کی اجازت نہیں دی جاتی ۔ حتی کہ دشمن کی رعایا کے تجارتی کاروبار برسر جنگ حکومت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے دشمن کی رعایا کو یا تو نظر بند رکھا جاتا ہے یا اُسے اپنے ملک کو واپسی کی اجازت دی جاتی ہے ۔ مگر موجودہ جنگ میں

متحاربین نے دشمن کی رعایا کو اپنے وطن کو واپسی کی اجازت نہیں دی متحارب ملک کی رعایا کو اپنے ملک میں عدالتوں میں چارہ جوئی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ البتہ دشمن کی رعایا پر کسی متحارب ملک کے باشندے کی جانب سے ملکی عدالت میں کسی حق کے سلسلہ میں دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ دشمن کے ملک سے تجارتی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی ڈاک کا تبادلہ راست عمل میں نہیں آ سکتا۔ ایک ملک کی سرکاری فوجوں کو دوسرے ملک کی سرکاری فوجوں پر عام طور سے اور رعایا پر چند شرائط کیساتھ حملہ کرنے اور گرفتار کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اعلان جنگ کیساتھ ہی ایک ملک کی رعایا کے دوستانہ تعلقات دوسرے ملک کی رعایا کیساتھ خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ مہذب ملکوں میں اعلان جنگ رعایا کے منتخب شدہ نمایندے ملک کی پارلیمان میں کرتے ہیں۔ اس لئے پارلیمان کا یہ طرز عمل پورے ملک کا طرز قانونی طور پر متصور ہوتا ہے۔

دشمن سے سلوک | دشمن دو قسم کے ہوتے ہیں مثلاً دشمن اشخاص اور دشمن رعایا۔ دشمن اشخاص میں افراد فوج کو درجہ اول کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ بری بحری اور ہوائی فوج اسمیں شامل ہے تنخواہ یاب ملازم، رضاکار، اپنے ہی ملک کی رعایا اگر دشمن کی فوج میں شریک ہو یا کسی غیر ملک کے باشندے جو دشمن کی فوج میں شریک ہوں یہ سب اول درجہ کے دشمن سمجھے جائینگے ان کو دوران جنگ میں قتل، زخمی، قید یا بے دست و پا کر کے مغلوب کیا جا سکتا ہے البتہ یہ یاد رہے کہ غیر ضروری سختی نہیں کی جا سکتی چونکہ مقصد صرف مجبور کرنا ہے۔ اگر کسی فریق جنگ نے دوسرے فریق جنگ کے افراد پر غیر ضروری سختی برتی تو وہ ایک مجرمانہ فعل سمجھا جائیگا۔ جسکا مقدمہ عدالت میں چلایا جائیگا باضابطہ تحقیق کی جائیگی اور مجرمین کو سزا دی جائیگی۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ سال جنگ روس و جرمنی کے سلسلہ میں دیکھا جرمنی کے کمانداروں نے اہل روس پر خارکوف میں غیر معمولی مظالم ڈھائے چنانچہ روس نے ۱۵ ڈسمبر ۱۹۴۳ء سے ان مظالم کی تحقیقات شروع کی اور چند جرمنوں کو سزائے موت دی گئی۔

سرکاری جنگی جہاز چلانے والے خواہ وہ بحری ہوں یا ہوائی یہ بھی درجہ اول کے دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ البتہ خانگی تجارتی جہاز چلانے والے دوسرے درجہ میں آتے ہیں۔ اسی طرح ملازمین ریلوے تاجر وغیرہ ان کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ گرفتار کیا جاتا ہے۔ پہلے ان سے اطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ جبراً گرفتار کیا جاتا ہے۔

فوج کے غیر فوجی افراد | فوج میں ایک حصہ ایسے لوگوں کا بھی ہوتا ہے جن کو جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مثلاً اخباری نامہ نگار۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ منطقہ جنگ سے لڑائی کے حالات فراہم کر کے اپنی ملک کے اخباروں کو بھیجائیں۔ اخباری نامہ نگار فوجی لباس پہنتے ہیں اور ایک امتیازی بیاج لگاتے ہیں۔ نہ تو ان کے پاس جنگی آلات رہتے ہیں اور نہ وہ آلات استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ البتہ گذشتہ

زمانہ میں خبر رسانی کے معنے جاسوسی لئے جاتے تھے اور جاسوسی کی سزا موت تھی۔ اب اخباری نامہ نگار اور جاسوس میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ اور فریق ثانی نامہ نگاران اخبارات کو دستیاب ہونے پر نظر بند کر لیتا ہے۔ غیر فوجی افراد میں تاجر، گداگر بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد اپنا روزگار پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔

انسانیت سے کام انجام دینے والے جیسے پادری، ڈاکٹر، نرسیں یہ سب غیر فوجی افراد ہیں۔ ان کو بھی دشمن نظر بند کر لیتا ہے اور ان کی حیثیت جنگی قیدیوں سے بہتر ہوتی ہے۔ اور ان سے جسمانی محنت نہیں لی جاتی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں سے دشمن اپنے دواخانوں میں ان کے پیشے کا کام لیتا ہے۔

اعزازی فوجی ہر ملک میں اس ملک کی چند مشہور اور سربرآوردہ ہستیوں کو فوج کے اعزازی عہدے دیئے جاتے ہیں (جیسا کہ ہندستان میں روساء ہند کو ملکہ معظمہ کی حکومت وقتاً فوقتاً ایسے فوجی عہدے دیتی رہتی ہے) یہ سربرآوردہ اشخاص وقتاً فوقتاً میدان جنگ میں فوج کی ہمت بڑھانے کیلئے جاتے رہتے ہیں ان کو فوجی مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ ایسے افراد اتفاقاً دشمن نظر بند کر لیتا ہے۔

دشمن علاقہ کی آبادی ہر وہ شخص جو دشمن کے علاقہ میں رہے وہ چہارم درجہ کا دشمن ہے خواہ وہ غیر فوجی ہو یا کسی غیر جانبدار ملک کا باشندہ۔ جنگ کی مصیبتوں سے شہری باشندے کسی نہ کسی طرح سے کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ جن میں غیر جانبدار ملک کے باشندے بھی شامل ہیں اگر دشمن کو معلوم ہو تو اس کا فرض ہے کہ حملہ کرنے سے پیشتر ان غیر جانبدار ملکوں کے باشندوں کو تخلیہ کی اطلاع دیدے۔ یا وہاں حملہ نہ کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی حملہ کے وقت اسی حملہ آور کے اشخاص دشمن کی قید میں ہوں اور وہ متاثر ہوں۔ باشندگان ملک کی جائیداد آئے دن کے حملوں سے تباہ ہو جاتی ہے۔ ملک میں اشیاء احتیاج کی کمی ہو جاتی ہے۔ سامان گراں ہو جاتا ہے۔ اگر اس علاقہ پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو قابض فوج کو اس مقبوضہ علاقہ پر چند حقوق حاصل ہو جاتے ہیں

البتہ قبضہ کے بعد نقصان رسانی کا حق قابض فوج کو باقی نہیں رہتا۔

قبضہ گیر فوج کو باغراض قبضہ چار قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ مقامی باشندوں سے غلہ وغیرہ کا کچھ حصہ لینے کا حق جسے (REQISITION) کہتے ہیں۔
۲۔ نقد رقم (CONTRIBUTION) ۳۔ جرمانہ FINE ۴۔ جسمانی محنت (MANUALLABOUR)

۱۔ غلہ وغیرہ لینے کا حق۔ قابض فوج غلہ کا کچھ حصہ جبراً لے لیتی ہے۔ تاکہ اس کی ضروریات پوری ہو سکیں ایسی جو چیزیں لی جاتی ہے۔ اختتام جنگ پر مفتوح سے تاوان کے طور پر ان رسیدوں کا معاوضہ دلایا جاتا ہے۔

۲۔ نقد رقم۔ قابض فوج شہریوں سے قبضہ رکھنے کے بعد لے لیتی ہے۔

۳۔ جرمانے۔ مقامی باشندے اگر قبضہ گیر فوج کے احکام کی تعمیل نہ کریں اور کسی مجرم کا پتہ نہ چل سکے تو انفرادی واجتماعی جرمانے کئے جاتے ہیں۔ غیر جانبدار ملک کے باشندے اگر اس خطے میں ہوں تو وہ بھی متاثر ہوں گے۔

۴۔ جسمانی محنت۔ مقامی باشندوں سے قبضہ گیر فوج اپنی ضرورت کے تحت نقل وحمل کے لئے جسمانی محنت لیتی ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں رسید دیتی ہے۔

(باقی دارد)

ہندوستان کی مظلوم عورت

قاضی عبدالغفار مدیر اخبار پیام

ہر روز اخبارات میں قتل و خون اور خودکشی کی ایسی خبریں شائع ہوا کرتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سماج کے دروبست میں عورت کس طرح ہدف مظالم بنائی جاتی ہے۔ ان مظالم کا ایک سبب مردوں کی طلب آتیہ جسکو وہ ازدواج کے پردے میں جہیز اور اس قسم کے دوسرے مفادات کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حال ہی میں دو اخباروں میں دو خبریں پڑھی گئیں۔ یہ ان ہزارہا خبروں میں سے صرف ایکدن کی دو معمولی خبریں تھیں۔ پہلی خبر یہ ہے کہ لکھنؤ کے ضلع میں ایک شخص نے اس بناء پر ناراض اور غضبناک ہو کر اس کے سسر نے پورا موعودہ جہیز نہیں دیا۔ اپنی نوعمر بیوی کی ناک اور ہونٹ دانتوں سے کاٹ ڈالے۔ اور اس جرم کا ارتکاب اس وحشیانہ طریقہ سے کیا گیا۔ کہ وہ بدنصیب لڑکی اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکی عدالت نے اس شخص کو سات سال قید سخت کی سزا دی دوسری خبر پنجاب کی ہے۔ ایک شخص نے صرف اس بناء پر ناراض ہو کر اپنی نئی بیوی کو چھت پر سے نیچے ڈھکیل دیا کہ اپنے جہیز میں ریڈیو سیٹ ایکر نہیں آئی تھی یہ شخص ہندو ہے۔ اور ایک ہندو معاصر اس مقدمہ پر اداریہ لکھتے ہوئے اس خوفناک حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔

ہمارے گھروں میں ہینگراؤں کیس روزانہ ہو رہے ہیں۔ جہیز کی لعنت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اور زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس کا شکار ہو رہا ہے پھر وہ شکایت کرتا ہے کہ نہ تو "سوسائٹی اس طرف توجہ دے رہی ہے۔ اور نہ ہندو لیڈر اسکو روکنے کی کوئی کوشش کر رہے ہیں۔ .... قصور ہندو لیڈروں کا ہے"

اس مہاسبھائی معاصر نے سادر کر اور رجعالی پراتند جیسے لیڈروں کی شکایت کی ہے کہ وہ سماج کی اس لعنت کو مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے یہی شکایت ہم اپنے مسلمان لیڈروں اور خصوصاً علماء کے طبقے سے کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہزارہا بلکہ لاکھوں گھر قرون وسطیٰ کے عقوبت خانے ہیں۔ جہاں عورتیں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیجاتی ہیں جہاں مردوں کا اقتدار عورتوں کے انسانی حقوق کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہے جہاں عورت حق و انصاف کے معمولی فائدوں سے بھی محروم رہتی ہے۔ لیکن کیا ہمارے لیڈر اور علماء جو یا تو ہندوستان اور پاکستان کے آزادی کیلئے اونچے اونچے علم اٹھائے پھرتے ہیں یا صرف اپنے طبقہ کے اقتدارات کی حفاظت کیلئے اللہ اور رسولؐ کے کلام کو سند لاتے ہیں۔ کبھی خود اپنے گھروں کی طرف بھی دیکھتے ہیں جن میں عورتیں بہت سے اسلامی اور شرعی حقوق سے

بھی محروم ہیں؟ پھر بھی قائدین کرام حق اور انصاف اور اسلام کے جھنڈے ہوا میں ہلاتے ہیں۔ اور لاکھوں انسانوں کے لئے بھرپور عقیدت و محبت بنتے ہیں!

بڑی لعنت جو مسلط ہے۔ ہمارے لیڈروں پر وہ ان کی کم نظری ہے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سماج کی اصلاح کے بغیر ہی سیاست کی بازی جیت جائینگے۔ مگر انہیں معلوم نہیں کہ وہ آزاد ہندوستان اور پاکستان دوزخ کا ایک انگارہ ہوگا جس میں عورتوں کی سماجی غلامی بدستور باقی رہے جسمیں لڑکیوں کے گلے اس لئے کاٹے جاتے ہیں کہ وہ اپنے جہیز میں سونے کے پازیب نہیں لائیں! یا ریڈیو سیٹ لیکر نہیں آئیں، یا موٹر کار نہیں لائیں یا اوس کے باپ نے داماد کے ولایت جانے کا خرچ برداشت نہیں کیا!! جس سماج کے جسم میں ایسا ناسور موجود ہو اور جس ناسور میں مرد کی خودغرضی ہوس، اور جبر و ستم کے یہ زہریلے کیڑے رینگ رہے ہوں اوس سماج کو کسی غیر ملکی اقتدار سے آزادی دلانے کی جد و جہد خود اپنی نفی ہے! — وہ مرد سیاسی انصاف چاہتا ہے جو خود سماجی انصاف کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے!۔ اپنے گھر کے اندر اون ہی اصولوں کو ٹھکراتا ہے جن کے لئے گھر سے باہر سر بکف نظر آتا ہے!! —— مگر دھوکہ اور خود فریبی کی یہ ایسی انتہا ہے جس کی تاریک گہرائیوں میں ہندوستان کے لاکھوں سر پھنسے ہوئے ہیں۔ اس میں بہت سے قوم کے لیڈر بھی ہیں، مصلح بھی ہیں، علمبردار انصاف و حریت بھی ہیں — سورج کی روشنی میں بڑے خدا ترس اور ہمدرد بنی نوع انسان بھی ہیں۔ لیکن اپنے گھروں میں وہ کیا ہیں اور اون شرمناک بے انصافیوں کا انسداد کرنے کی اُنہوں نے آج تک کیا کوشش کی ہے۔ جو سماج کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی ہیں۔ یہ بات کوئی ہمیں بتائے

جن مقدمات کا ہم نے ذکر کیا وہ ہزاروں میں سے صرف دو ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ خوفناک اور شرمناک ڈرامہ ہماری سماج کے اسٹیج پر ہر روز ہی جاری رہتا ہے اور عورتوں کا وجود اسقدر حقیر اور ناقابل اعتنا سمجھ لیا گیا ہے اونکی مصیبت ہمارے بہت ہی اونے معمولات میں شامل ہے جو کسی خاص توجہ کی مستحق نہیں! کتنے ادارے اور کتنی انجمنیں، اور کتنے لیڈر ہمارے ملک میں ایسے ہیں جنہوں نے اپنے گھروں اور اپنے خاندانوں میں بھی مجبور اور مقہور عورت کیساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہو؟ پھر وہ مردوں کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے ملک یا اپنی قوم کے لئے کس منہ سے انصاف مانگتے ہیں!!

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی؟

اب اصلاح کی جو کچھ امید ہے وہ خود خواتین کی بیداری سے وابستہ ہے۔ مگر ابھی تو یہ بیداری بھی بہت کم ہے!

"ادب"

خواہ وہ کسی زبان ہی کا کیوں نہ ہو ہمیشہ ماحول کی ترجمانی کرتا رہا ہے۔ اردو ادب کو ماحول سے روشناس کرانے اس کی شدید ضرورت ہے عشق و محبت ہمارے وقت کا اہم مسئلہ نہیں ہے۔

غمِ حیات

سیف الدین خالد

نہ تو میں افسانہ نگار ہوں اور نہ کوئی مصنف مگر اپنے ایک دوست کی نامراد زندگی کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ایسا کرتے ہوئے اگرچہ مجھے اس کی ناشاد ماں روح سے شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے۔ مگر جانے میں کیوں ایسا کر رہا ہوں۔ جمیل خطا پوش انسان تھا ممکن ہے۔ بلکہ مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ مجھے معاف کر دے گا۔ ہاں تو میں اس حرماں نصیب جمیل کی داستان حیات سناؤں گا۔ شاید ایسا کرنے سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

جمیل سے میری پہلی ملاقات سوئمنگ باتھ میں ہوئی تھی وہ سینہ بڑی بڑی آنکھیں خوبصورت دیکھنے میں ہشاش بشاش وہ ہنس کر جینے اور ہنستے ہوئے مرنے کا قائل تھا پھر بھی کس کا درد چھپا نہیں رہتا۔ اس لئے راز ہوتے ہیں کہ انہیں افشا کئے ہی بنتی ہے زبان بند کر لینے سے مافی الضمیر چھپ نہیں جاتا۔ جب میں نے اسے سوئمنگ باتھ میں دیکھا تو میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی اس کی غم آلود نگاہیں اور وہ چہرے کی بے کسی مجھے بار بار مجبور کرتی رہی کہ میں اس سے ملوں اس کی نگاہوں میں تلخی حیات کی ایک داستان تھی۔ ایک غم آلودہ تبسم ہمیشہ ہونٹوں پر کھیلتا رہتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی ہنسی دنیا کی ناپائیدار خوشی پر ایک طنز ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کی طرف کھنچتا گیا قریب ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کے دل کی دھڑکنیں اپنے قریب محسوس کیں اب جب کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تاریک رات کے بھیانک ماحول میں اس کی داستان قلمبند کر رہا ہوں اب بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمیل میرے سامنے بیٹھا ہوا غم آلودہ نگاہوں سے مجھے تک رہا ہے۔ آہ اس کا ٹوٹا ہوا دل۔؟

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے بھیگی بھیگی اداس شام کو جمیل اپنے کمرے میں سر جھکائے۔ خاموش بیٹھا تھا بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور انہیں بھی اس نے اپنی بکھری ہوئی زندگی کی طرح بغیر سلجھائے چھوڑ دیا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا ہر قدم تباہی کی جانب بڑھے اور لڑکھڑائے گرے اور پھر اٹھے اور گرے یوں ہی اپنی زندگی کا بے کیف سفر ختم کر دے وہ اپنی اس زندگی کو بھٹکتی ہوئی روح سے تعبیر کرتا تھا جس میں ہر تاریکی کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ کتنا صحیح تھا اس کا خیال ٹوٹی ہوئی زندگی ہی تو نمایاں کر دیا کرتی ہے۔ اکثر میں [illegible] اس کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا اسے محسوس بھی نہ ہو سکا کہ کوئی اس کی اس لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی حالت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہیں اور وہ ایک خاص انداز میں بیٹھا ہوا فرش کی سلوٹوں کو تک رہا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سرگوشیوں سے ملتی ہوئی آوازیں

کہنے لگا ۔ زندگی اور زندگی کی سلوٹیں اس نے نظریں اٹھائیں مجھے
دیکھا ۔ بولا تم "ہاں میں" میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی
مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کس جرم کا ارتکاب
کیا ہے ۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور پھر حسب معمول اپنی بناوٹی
شگفتگی سے بولا اچھا ہوا جو تم آگئے میں تمہارا ہی انتظار کر رہا
تھا ۔ چلو سینما چلیں آج جی چاہتا ہے ۔ میں نے کسی آمادگی کا
اظہار نہیں کیا وہ پھر بولا کہاں چلو گے میں نے اس کی بوجھل
طبیعت کو دیکھا اور سوچا کہ اسے ٹریجڈی اور متاثر کرے
گی میں نے کہا مقدر دیکھنے چلیں کامیڈی ہے کہنے لگا زندگی ہنستے
ہی گذر جاتی ہے رونے کے موقع کم ملتے ہیں دنیا میں راجہ دیکھیں
گے سنا ہے راجہ اچھا کھیل ہے اب اسکی طبیعت پھر
کھل اٹھی وہی بشاشت اور وہی تبسم ۔ میں سوچ رہا تھا جمیل
دنیا کو دھوکا دینا چاہتا ہے ۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی سے محبت
کرتا ہے ۔ لیکن ان ٹریڈ مارک عاشقوں کی طرح نہیں جنکا
معیار حسن ہر قدم پر گھٹتا اور بڑھتا ہے اور جو اپنی داستان
عشق سنانے کو طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں ۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ
وہ پروانوں کی طرح جلنا اور جلکر خاموش رہنا چاہتا ہے
اس دن میری نگاہوں نے اس کا بناوٹی چہرہ پہچان لیا
اور میں نے طے کر لیا کہ اس کی داستان سنوں گا اور اس
کے مستقبل کو بھیانک وادیوں میں بھٹکنے نہ دونگا کاش میں
کچھ کر سکتا اس کے لئے ؟

ہم راجہ دیکھنے گئے سینما ہال کی خاموش
وسعتوں میں میں نے جمیل کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنیں اور
جب ہم باہر نکلے تو اس کے چہرہ پر ایک سکون تھا ایسا سکون
جو کسی بوجھ کے اتر جانے کے بعد عموماً ہوا کرتا ہے ۔ راستہ
بھر وہ خاموشی سے موٹر چلاتا رہا میں نے بھی کچھ پوچھنا مناسب
نہ سمجھا مگر پھر یکایک وہ کہنے لگا ۔

" امجد سچ ہے زندگی درد کا سودا ہے ۔ ایک تلخ شراب
ہے ۔ ہاں سچ تو ہے ۔ مگر یہ انسان کے بس کی بات
ہے ۔ چاہے تو مسلسل قہقہہ بنا دے زندگی کو چاہے تو آنسوؤں
میں بدل دے ۔ میں نے کہا درد کا جو احساس ہوتا ہے تم
کیا جانو امجد جمیل بولا ۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جمیل آج اپنے دل کا سارا
بوجھ اتار دینا چاہتا ہے ۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا جمیل کہنے لگا
زندگی کا سچا سودا یہی ہے کہ اسے درد کے ہاتھوں
بیچ دیا جائے ۔ امجد میں نے بھی یہ سودا کیا مذاق نہ سمجھو میں
نے بھی سودا کیا ۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی
آنکھوں میں یاس کی تاریکی کروٹیں لے رہی تھی اور ایک
تشنج کیفیت اس پر طاری ہو گئی کہنے لگا میرا یہ سودا کامیاب
ہوتا نہیں دکھائی دیتا بعض دفعہ گھاٹا بھی تو ہو جاتا ہے ۔
امجد یہ سودا میں نے سال پہلے کیا تھا اور شاید یہ غم
حیات ہو جائے ۔ دو سال ہوئے میری ملاقات اس سے
ہوئی ۔ زاہدہ ایک جج صاحب کی لڑکی ہے ۔ میں اس کے
پاس آتا جاتا رہا جج صاحب کی بیوی مجھے بہت چاہنے
لگیں میں نے زاہدہ کے حسن دلفریب کو دیکھا اور فقط دل
نذر کر دیا ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ زاہدہ نے میرے دل کی

قیمت نہ جانی ۔ میں اس پر یہ الزام نہیں لگاؤں گا ۔ سارا
الزام قسمت کو دونگا ۔ ہندوستان کی بھولی بھالی لڑکیاں
یہ سودا اگر کرتی بھی ہیں ۔ تو ظاہر نہیں کر سکتیں اُن کی مرضی
اُن کی اپنی مرضی نہیں وہ ماں باپ کی تمناؤں کیلئے جیتی
ہیں ماں باپ چاہیں جہنم ہی میں کیوں نہ جھونک دیں
وہ یہی کہیں گی اُنہوں نے جو کچھ کیا ہماری بھلائی کیلئے کیا
زہر کو تریاق سمجھکر پینے والی کئی لڑکیاں محبت کی قربان
گاہ پر قربان ہوگئیں جمیل کے چہرہ پر غصہ جھلکنے لگا ۔ رات
کی خاموشی وسعتوں میں ایک دردناک آواز بلند ہوئی

کسی سے عشق ہے لیکن جتا نہیں سکتے
تعینات کے پردے اٹھا نہیں سکتے ۔ امکش

جمیل بولا سن رہے ہو یہ نالہ جانتے ہو کون ہے میں نے
بصورت انکار سر ہلایا ۔

مس رابرٹ یہ بھی ایک عورت ہے ہر ایک
سے محبت کرتی ہے پھر بھی کہتی ہے ۔ تعینات کے پردے
اٹھا نہیں سکتے اب بھی شاید اپنے کسی محبوب کو پکار رہی
ہو یہ بھی ایک روپ ہے ۔ عورت کا ایسی عورتیں دوسروں
کو صرف درد دے سکتی ہیں ۔ اور زیادہ سے زیادہ درد
دیتی ہے ۔ درد لیتی بھی ہے ۔ جلتی ہے مگر خاموش بھی رہتی
ہے عورت عورت میں اتنا بڑا تضاد کیوں ہے امجد؟
ارشد اور ماحول میں بولا ارشد کہیں کہیں
جھلک ہی جاتا ہے ۔ ماحول اس پر رنگ چڑھاتا ہے
ایسی لڑکیوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے ۔ جمیل وہ خاموش
ہو گیا شاید تخیل کے اتھاہ ساگر میں غوطے کھانے لگا میں
نے سوچا اسے تنہا چھوڑ دوں میں جانتا تھا کہ فنکار
کے مسل تنہا رہنا پسند کرتے ہیں ۔

بہت جلد میں اور جمیل ایک دوسرے کے قریب ہوتے
چلے گئے اور جیسے جیسے دن گذرتے جاتے مجھے یہ محسوس
ہوتا کہ جمیل ہر راز کو کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے مجھے
یہ محسوس ہوا کہ جمیل مجھے اپنے گلے لگا کر رونا چاہتا ہے
اتنا رونا چاہتا ہے کہ دل کے سارے بوجھ اتر جائیں
اور وہ ایک ہلکی کشتی کی طرح بسیط سمندر کی سطح پر ہوا
کے جھونکوں کے سہارے چلا جائے ۔

جمیل کی حالت اس وقت ایک ایسے ساز کی تھی
جس کے تار بہت زیادہ کسے ہوئے ہوں ہوا کا ایک ہلکا
سا جھونکا بھی جن میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے ۔ اور
ساز کا ہر پردہ نوحۂ غم سنانے لگتا ہے ۔

ایک دن وہ میرے پاس آیا میں نے دیکھا طبیعت
کچھ بحال ہے ۔ چہرے پر غم کی اگلی سی گھٹائیں نہیں
ہیں بات بات پر مسکرا رہا تھا میں بھی کھل اٹھا آج
میرا دوست میری زندگی میں پہلی بار میرے سامنے
مسکرا رہا تھا میں نے اسے گلے لگایا پر کتنی جلد فنا ہونے
والی تھی اس کی ہنسی مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا یہ مسکراتا
ہوا دوست اس کے بعد پتھر کی مضبوط چٹان کی طرح
منجمد ہو جائے گا میں نہیں جانتا تھا کہ اسکی مسکراہٹ
چراغ سحری کی طرح ہے میں نے اس کے بعد ایسے نہ

مسکراتے ہوئے دیکھا نہ ہی روتے ہوئے اس کے سارے احساسات یخ بستہ ہو گئے تھے

اس دن اسکی زندگی میں ایک بڑا انقلاب ہوا تھا قدم قدم کی ٹھوکروں نے اسے مجبور کر دیا۔ وہ ایسا کرنے میں وہ کتنا حق بجانب تھا یہ میں جانتا ہوں زاہدہ کے ماں باپ نے جب دیکھا کہ جمیل کسی طرح بھی ان کی زاہدہ کا رفیق نہیں ہو سکتا انہوں نے نگاہیں پھیر لیں زاہدہ عورت تھی خاموش جلنے والی شمع کی طرح وہ جل تو رہی تھی مگر ایسے کہ روشنی کی چکا چوند میں کسی نے بھی اس شمع کو نہیں دیکھا جو اپنی متاع لٹا رہی تھی میں ایک پرکٹے پرندے کی طرح بے بس تھا میں دونوں کے درد سے واقف تھا۔ مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا سوچتا تھا قدرت نے انسان کو مجبور کیوں پیدا کیا تو یہ درد کیوں سونپا۔ اپنے ایک دن جمیل نے بھی کہا تھا۔ قدرت ظالم ہے۔ تم ظلم کرتے ہو تو تمہارے ہاتھ پکڑے جاتے ہیں میں پوچھتا ہوں قدرت کے سنگیں ہاتھ کیوں کوئی نہیں تھام سکتا اور جانے کیا کیا کہدیتا وہ زندگی کے ایک موڑ سے گذر چکا تھا۔ اور دوسرے موڑ کی طرف جا رہا تھا۔ زندگی کا موڑ کتنا خطرناک تھا وہ موڑ کے ہر قدم پر بڑے بڑے غار تھے۔ ڈسنے والے ناگ کالے کالے ناگ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا میرا دوست دشوار گذار راستے سے صاف نکل گیا میں دور کھڑا ہوا اس کو سائے کی طرح غائب ہوتے دیکھ رہا تھا۔۔۔

مس رابرٹ کی اداؤں نے معصومیت اختیار کر لی وہ ایک بے ضرر ناگن بنکر اس کے گلے میں حمایل ہو گئی کتنے برے تھے اس کے شکنجے جمیل پھنچا گیا یہاں تک کہ اس سے اسکی زندگی کا حقیقی جوہر ہی چھن گیا ناگن ——— ناگن نے اپنا انتقام لیا جب اسکے شکار کا جوڑ جوڑ ڈھیلا پڑ گیا تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور اپنے بے بس صید کو ٹھوکر لگاتی ہوئی دوسرے شکار کی تلاش میں مڑ گئی۔ ایک طرف سے مایوس ہو کر ٹوٹا ہوا دل بہلانے کیلئے جمیل نے ایک سہارا ڈھونڈ لیا تھا۔ سہارا ——— لیکن کوئی بھی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا نہ رہا۔ دنیا نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس کا جوڑ جوڑ ڈھیلا کر دیا ——— میرا عزیز دوست؟

زاہدہ بھی بری طرح پستی گئی اب دونوں مجروح پرندوں کی طرح قریب ——— قریب پڑے تھے کسی میں بھی سکت نہیں تھی کہ ایک دوسرے کی مدد کرتے دو مجروح پرندے کاش میں دونوں کے لئے کچھ کر سکتا لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں شادیانے بج رہے ہیں زاہدہ اور جمیل دونوں مجھے اشارے سے بلا رہے ہیں دور افق کے پار دو پرندے پنکھ ملائے چلے جا رہے تھے چلے جا رہے تھے ——— ان کی منزل ———

چار کامریڈ

مسلم علی (عثمانیہ)

"پہلا منظر"۔

چار قیدیوں نے — دو چینی (چن اور ذی) ایک ملایائی (عمر) ایک ہندوستانی (رتن) سیل قائم کی چاروں ٹریڈ یونین کے کارکن تھے۔ جو مزدوروں کی ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوئے تھے چاروں گفتگو میں مشغول ہیں۔ رتن کیسقدر متفکر اور غمگین بیٹھا ہے

چن — تین سال — یہ وہ طویل عرصہ ہے جو ہم جیل میں گذار چکے ہیں۔

ذی — لیکن طویل انسانی کہانی میں تین سال کی کیا حقیقت؟ کئی ایک کو جیل میں اس سے بھی زیادہ عرصہ گذارنا ہے۔ موت تک۔ جب کہ ہم انسان کے انسان کو لوٹنے کا خاتمہ نہ کریں ...... رتن تم کیا سوچ رہے ہو؟ کیا اپنے محبوب وطن کے خیالات میں محو ہو؟

رتن — ہاں — مگر ماضی کے ہندوستان کیلئے نہیں بلکہ مستقبل کے ہندوستان کیلئے سوچ رہا ہوں اس مستقبل کیلئے جس میں ہندوستان اور چین کی جنتا آزادی کی سانس لیگی میں نے اپنی عمر کے پندرہ سال چین میں کام کرتے گزارے — مجھے چین سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی ہندوستان سے ہے۔

ذی۔ اس جنگ کی روئداد بھی عجیب تعجب خیز ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرا محبوب کانٹن بھی جاپانیوں کے قبضہ میں آگیا ہوگا۔

عمر — کیوں پریشان ہوتے ہو اب یہ جنگ چین اور جاپان کی جنگ نہیں رہی یہ تو اب دنیا کے اعلیٰ انسانوں اور فاشست درندوں کی جنگ ہے۔ روس اب جمہوریتوں کا ساتھ دے رہا ہے ہمکو یقین ہے کہ ساری دنیا کے عوام ایک ساتھ ابھرینگے تاکہ ان تینوں فاشست قوتوں جرمنی اٹلی اور جاپان کا خاتمہ کردیں۔

چن — جاپان؟ مگر جاپان تو کوشاں ہے کہ اس جنگ میں اپنے کو کسیطرح شریک نہ کرے اور ہم چینیوں کو تنہا اس سخت قوت کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ذی۔ مگر جاپان کا یہ ارادہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا بالآخر اسکو اپنے ہم نظریہ قوتوں کے دوش بدوش جنگ میں شریک ہونا ہی پڑیگا۔

چن — (بات کاٹتے ہوئے) وہ ٹھگوں کی جماعت ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جاپان کی حرص صرف چین ہی

پر اکتفا کریگی - میرا یہ خیال ہے کہ وہ برما اور ہندستان کو بھی فتح کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہوگا -
اس طرح یہ تینوں کیڑے دنیا کو بانٹ لینا چاہتے ہیں -

عمر (مسرت سے) میری کتنی خواہش ہے کہ جاپان مغربی قوتوں کیساتھ جنگ میں شریک ہو جائے -
تب اس بھیڑئے کو زندگی کا صحیح سبق ملیگا
مجبور اور امن پسند چین سے لڑنا اور برطانیہ اور امریکہ سے بھڑنا - جدا گانہ چیزیں ہیں - اور میری تو یہ خواہش ہے کہ . . . .

(دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے اور عمر ایک لخت خاموش ہو جاتا ہے اور ایک نگران کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹی قیدیوں کی طرف پھینک کر واپس چلا جاتا ہے) -

ذی - (تھیلی اٹھا کر) بھائیو چار اکھانا آچکا ہمکو اپنی بحث ملتوی کرنا چاہئے - (چاروں حلقہ بنا کر کھانا کھانے بیٹھ جاتے ہیں - ذی تھیلی کھولتا ہے چن پیٹے ہوئے کاغذ کو اٹھا لیتا ہے اور خبریں پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

چن - (مسرت سے چیختے ہوئے) . . . ہرا - جاپان اور امریکہ میں جنگ چھڑ گئی (تمام کامریڈ کھانا چھوڑ کر اسکے اطراف جمع ہو جاتے ہیں) -

ذی - میں بھی تو دیکھوں . . میں بھی تو دیکھوں (آہستہ آہستہ پڑھتا ہے) -

رتن - بلند آواز میں پڑھو - ذی - تاکہ ہم بھی سن سکوں

ذی - جاپان نے بالآخر سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالدیا وہ پرل کی بندرگاہ پر حملہ کرنے کے قطعی ناقابل تھے برطانیہ اور امریکہ دونوں نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا -

عمر - لیکن کب؟ کب یہ روبہ عمل آئے گا -

چن - (تاریخ دیکھتے ہوئے) اس کو عمل میں آئے کئی ہفتے گزر گئے لیکن ہمیں اس کی خبر ہی نہیں -

رتن - کئی ہفتے؟ لیکن تمہیں معلوم ہے اس کے کیا معنے ہوسکتے ہیں

ذی - کیا؟

رتن - ممکن ہے سنگاپور پر بھی جاپانیوں کا حملہ ہو - ہم جاپان کے مقبوضہ مقام سے چند ہی میل کے فاصلے پر ہیں (آہستہ مگر موثر لہجہ میں) کیا تم اندازہ کر سکتے ہو اگر وہ ہمیں پالیں تو کیا سلوک کرینگے؟

عمر - اس میں شک نہیں - دوسرے بھی ہمارے دشمن ہیں لیکن جاپانی - وہ مزدوروں کی طرف سے احتجاج کرنیوالوں کو گولی ماردیں گے

چن - گولی ماردینگے؟ یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ رحم پر اتر آئیں - جاپانی سرمایہ داروں کو "کمیونسٹوں" اور مزدور کارکنوں سے دلی نفرت ہے صرف گولی ماردینے سے انہیں تسکین نہیں ہوسکتی

ذی - تم کو یاد ہوگا - انہوں نے کوریا اور منچوریا میں ہمارے کامریڈز کیساتھ کیسا سلوک کیا تھا (فاصلہ پر ایک شل پھٹنے کی آواز آتی ہے)

حمرا ۔ یہ کیا ہے؟

رتن ۔ جنگ کے راگ (کھڑے ہو کر) کامریڈز یہ جگہ چھوڑنے کیلئے فوراً تیار ہو جانا چاہئے کم از کم میں تو یہ نہیں چاہتا کہ اس بل میں چوہے کی طرح پکڑا جاؤں ۔

تمام ایک آواز ہو کر"۔ اور ہم کب چاہتے ہیں

چن ۔ مگر ہمیں کرنا کیا ہوگا؟ ہم یہاں سے کسطرح فرار ہو سکتے ہیں"۔

رتن ۔ ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور سوچنا چاہئے (دروازہ کھلنے کی آواز) خاموش کوئی آرہا ہے ذی تم نگران کو باتوں میں لگا دیں پیچھے سے وار کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ یہ وقت ہراسانی کا نہیں

(نگران داخل ہوتا ہے)

ذی ۔ (انتہائی سنجیدگی سے) ہلو نگران صاحب ہم آپ کی تشریف آوری کا کیسے شکریہ ادا کریں۔

(رتن پیچھے مستعدی سے آتا ہے۔) ہم آپکو یقین دلاتے ہیں کہ ہم رفتہ رفتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نگران ۔ تم آزاد کردئے گئے ۔

سب (متعجب ہو کر) کیا؟ (رتن اپنا ہاتھ نیچے کر لیتا ہے ۔)

نگران ۔ ہاں ۔ اس جزیرہ پر جاپان نے حملہ کر دیا ہے اور یہ حکم ہوا ہے کہ تمام قیدی آزاد کر دیے جائیں تم لوگ جا سکتے ہو (دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے)

ذی ۔ مجھے مشکل ہی سے یقین آتا ہے (یکایک حالات پلٹ جانے سے حیران ہو کر بیٹھ جاتا ہے ۔

اور دوسرے کامریڈز بھی بیٹھ جاتے ہیں)

عمر ۔ ہمیں اب کیا کرنا ہوگا؟

چن ۔ کیا کرنا ہوگا؟ یقیناً جاپان سے لڑنا ہوگا ۔ (رتن کی طرف دیکھتے ہوئے ۔ لیکن رتن کی او[ر] بات ہے وہ ممکن ہے وہ جاپان سے لڑنا نہ چاہے ۔ کیونکہ اس کے وطن پر حملہ نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رتن ۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) چن تم یہ کیا کہہ رہے ہو کیا تم ایک لمحہ کیلئے بھی یہ سوچ سکتے ہو کہ میں تم کو جاپانیوں سے بھی حقیر سمجھونگا جو چین کی طرح ہندوستان کے بھی دشمن ہیں ۔ بہر حال ہم کوتاہ ذہن وطن پرست نہیں ہم وہی کرینگے جسمیں تمام دنیا کے مزدوروں کا مفاد ہو تاکہ فاشیزم کا خاتمہ کر دیں جو انتہائی ضروری ہے ۔ اس کے سوا جفاکش عوام کیلئے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں (کھڑا ہو جاتا ہے ۔)

ذی ۔ ہم اپنا کام اب کسطرح شروع کریں ۔

رتن ۔ ہم فوراً اپنے دوسرے بھائیوں کے نام اعلان جاری کریں ۔

(رتن اعلان کا مضمون سناتا ہے)

کامریڈز ۔

تین سال جیل میں رہنے کے بعد جب ہم باہر آئے

تو دنیا کا نقشہ بالکل بدل چکا ہے۔ ایک وسیع جنگ عالم پورے عروج پر ہے۔ تینوں فاشسٹ ممالک۔ جرمنی اٹلی اور جاپان دنیا کے تمام ممالک کی جنہیں مزدوروں کا "فادر لینڈ" سوویٹ یونین بھی شامل ہے آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں۔ اسکے یہ معنے ہوئے۔ کہ وہ ساری دنیا کے مزدوروں کی اصلی آزادی کی امید کو پریشان کرینگے۔

تمکو معلوم ہے فاشیزم کی فتح کے کیا معنے ہیں جہاں جہاں بیدار وطن پرستوں کے اثرات ہیں ان کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اسلئے ہم روحانیت ہیں کہ آخری خون کے قطرے تک ان کا مقابلہ کریں ہمیں چاہیئے کہ ہر گلی ہر مکان اور ہر کمرہ کو محاذ بنائیں ہم جاپانی حملہ آوروں کا گلی گلی گھر گھر اور کمرہ کمرہ مقابلہ کرینگے۔

"پردہ"

(دوسرا منظر)

(سنگاپور کا ایک کمرہ جس کا کچھ حصہ بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔ چاروں کامریڈ نہایت دلیری سے جاپانی حملہ آوروں سے کمرہ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ "ذی" اور "عمر" زخمی ہو چکے ہیں "چن" اور "رتن" ان دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اتنے میں بندوق چلنے کی آواز آتی ہے اور چن زمین پر گر پڑتا ہے رتن اپنے کامریڈ کو مرتا ہوا دیکھکر انتہائی غصہ میں اپنی رائفل اٹھا لیتا ہے۔ اور ٹھیک نشانہ لیکر کھڑکی سے گولی چلاتا ہے۔ ایک جاپانی سپاہی کی چیخ سنائی دیتی ہے۔

رتن۔ نجس کتے۔ (یہ بھی نے دبیر گولی چلاتا ہے)

عمر۔ (چن کے زخموں پر پٹی باندھنے کی کوشش کرکے اور اسے فضول پاکر) چن چن خدا کیلئے کچھ تو بولو کامریڈ کیا تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤگے؟ (چن جوں ہی اپنی آخری سانس لیتا ہے۔ اس کا سر ڈھلک جاتا ہے۔ ذی اسکے چہرہ کو ڈھانک دیتا ہے) میرا کامریڈ ہمیشہ کیلئے جدا ہو گیا (دیوانگی کے عالم میں) ناپاک کیڑے۔ میں ان کو مزہ چکھاؤنگا۔ میں ان تمام کو مار ڈالونگا۔ (دروازہ کی طرف دوڑتا ہے۔ رتن اور ذی اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ بغیر رکے دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے اور گولیوں کی مسلسل آوازیں آتی ہیں۔

(جوں ہی عمر کو گولی لگتی ہے۔ عمر کی آواز آتی ہے)

آہ۔ آہ۔ انہوں نے مجھے پالیا۔ چن میں آرہا ہوں (اسکی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی۔ رتن اور ذی شدت غم سے اپنے سر جھکا لیتے ہیں پھر وہ ابھی اپنی بندوقیں سنبھالکر گولیاں چلانے لگتے ہیں۔

ذی۔ وہ دیکھو وہ لوگ بہت قریب آگئے (بندوق چلاتا ہے)

رتن ۔ ہماری توپوں کی آوازیں نہیں آتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنگاپور کی جنگ ختم ہو گئی بہر حال ہمارے لئے تو ابھی ختم نہیں ہوئی (بندوق چلاتا ہے)

ذی ۔ عجیب بات ہے میں چینی اور تم ہندوستانی جاپان کے خلاف دوش بدوش لڑ رہے ہیں ۔

رتن ۔ (بندوق چلاتا ہے) ایسے عمر کی خاطر اسے کیٹرو ادی کا جواب دیتے ہوئے (مجھے کافی عرصہ پہلے ہی یقین تھا کہ ہمارے ملک اپنے اس مشترکہ دشمن کا دوش بدوش مقابلہ کرینگے ۔

ذی ۔ ہندوستان زندہ باد تمام ملکوں کا مزدور طبقہ زندہ باد (جذبات میں اپنے آپکو کھڑکی کے سامنے کر دیتا ہے بندوق کی آواز آتی ہے ۔ اور وہ کراہتے ہوئے زمین پر گر پڑتا ہے

رتن ۔ (نیچے جھکتے ہوئے) ذی ۔ میرے کامریڈ بالآخر انہوں نے تمہیں بھی اپنا نشانہ بنا لیا ۔

ذی ۔ رتن (رکتے رکتے بات کرتا ہے) بہتر یہ ہے کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ ۔ ۔ ۔ ہندوستان جا کر جنتا سے کہو کہ انہیں ایک زبردست خطرہ کا سامنا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آج ملایا خطرہ میں ہے ۔ ۔ ۔ کل برما خطرہ میں ہو گا ۔ ۔ ۔ پھر ہندوستان ۔ ۔ ۔ خدا حافظ رتن (مر جاتا ہے)

رتن ۔ (ذی کی آنکھیں بند کرکے اور اس کے جسم کو ڈھانک کر) خدا حافظ کامریڈ (کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور نشانہ لیکر بندوق چلاتا ہے) اب آؤ نجس کتو میں تنہا تمہارا مقابلہ کرونگا (پھر بندوق چلانے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن کارتوس ختم ہو جاتے ہیں، بندوق بیکار ہو گئی (جھنجلا کر اسے پھینک دیتا ہے جاپانیوں کے قریب آنے کی آواز آتی ہے) آنے دو انکو (جاپانی سپاہی اور ایک افسر داخل ہوتے ہیں)

جاپانی افسر ۔ (رتن کیطرف پستول کا نشانہ لیکر) ہاتھ اوپر کرلو ۔ ہمنے بالآخر تمہیں پا لیا (نزدیک آکر) ہندوستانی ؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟

رتن ۔ ہاں ۔ ہندوستانی میں جاپانی فاشزم اور درندگی کا مقابلہ کر رہا ہوں ۔

(ایک جاپانی سپاہی اس تذلیل پر رتن کو مارنے کے لئے اپنی رائفل اٹھاتا ہے مگر افسر روک دیتا ہے ۔

افسر ۔ (سپاہی سے) ایک منٹ تو توقف کرو ۔ (رتن سے) سنو تم ہندوستانی ہو اور ہمارا اور ہندوستانیوں کا تو جھگڑا نہیں پھر ہم تمہیں کیوں مار ڈالیں ہم نہ صرف تمہاری جان بخش دینگے بلکہ حفاظت سے تمہیں تمہارے وطن بھی پہنچا دینگے بشرطیکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رتن ۔ بشرطیکہ ۔ ۔ ۔ ؟

افسر ۔ بشرطیکہ تم ہماری دوستی قبول کر لو (ہاتھ بڑھاتا ہے)

رتن ۔ تم اپنا ہاتھ دور ہی رہنے دو میں قاتلوں اور لٹیروں سے دوستی کرنا گوارا نہیں کرتا ۔

افسر ۔ (پریشان ہو کر) تم ہندوستان واپس جانا نہیں

چاہتے۔ اور وہاں کے لوگوں کو یہ بتلانا نہیں چاہتے
کہ جاپانیوں نے نہ ہی تمہاری صرف جان بخشی بلکہ
تمہیں ہندوستان کی سرزمین پر حفاظت سے پہنچا بھی
دیا اور عنقریب وہ ہندوستانی عوام کو انگریزوں
کے پنجے سے چھڑانے ہندوستان آنے والے ہیں

رتن ۔ (ہنستے ہوئے) جاپانی اور ہندوستان کو آزاد
کرنے آ رہے ہیں ۔ یہ تو بیحد دلچسپ لطیفہ ہے
..... ہا ہا جس طرح تم نے منچوریا کوریا اور چین
کو آزادی بخشدی ۔ ہم ہندوستانی ایسے بیوقوف
نہیں کہ اپنی موجودہ بندش کو ایک ذلیل غلامی
سے بدل لیں ۔

افسر ۔ (اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر) نشانہ لے لو
(رتن سے) تم جانتے ہو میرا ایک لفظ تمہاری
جان لینے کیلئے کافی ہے ۔

رتن ۔ میں کبھی نہیں مر سکتا وہ جذبہ جسنے مجھے لڑنے پر
مجبور کیا کبھی فنا نہیں ہو سکتا وہ تو کچھ اور اعلیٰ
ترین چیز کے لئے ابھرا ہے تم اس جذبہ کو ہرگز
فنا نہیں کر سکتے تمام ملکوں کے عوام متحد ہو چکے
ہیں تم اس اتحاد کو نہیں توڑ سکتے ..... چالیس
کروڑ انسان میری جگہ لینے کیلئے تیار ہیں ۔

افسر ۔ غالباً تم یہ بھول گئے جس کا ہم یقین دلا چکے ہیں کہ جوں
ہی ہماری فوجیں ہندوستان کی سرزمین پر اتریں گی
ہندوستانی ہمیں خوش آمدید کہینگے ۔

رتن ۔ تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں کہ تمہارا کتنی گرمجوشی
سے استقبال کیا جائیگا ۔ ہندوستانی ساحل
پہ قدم رکھنے کی کوشش کرو اس کا تمہیں جلد
اندازہ ہو جائیگا ۔ چین ہی کی کہانی ہندوستان
میں بھی دہرائی جائیگی ۔

افسر ۔ تمہاری زندگی کا ایک اور منٹ باقی ہے

رتن ۔ مگر میں تو مر نہیں سکتا ۔ میں پھر پیدا ہونگا ۔ میں ہر
ہندوستانی کی قوت میں پھر پیدا ہونگا ۔ جو تمہارے
خلاف جنگ کریگا ۔ تم جہاں کہیں بھی ہندوستان
میں جاؤگے ۔ کلکتہ میں اور بمبئی میں مدراس میں
اور کراچی میں ۔ مجھے ہر جگہ پاؤگے تم مجھے نہیں مٹا سکتے
(افسر سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے ۔ میں ہرگز نہیں
مرونگا (مسلسل گولیاں چلتی ہیں اور رتن زمین پر
گر جاتا ہے ۔ ایک لمحہ کیلئے سکوت رہتا ہے ۔ پھر
جاپانی افسر کو رتن کی اور کئی آوازیں سنائی دیتی
ہیں وہ اپنے اطراف دیکھنے لگتا ہے ۔ مردہ جسم کو
دیکھتا ہے ۔ اور ان دہشتناک آوازوں سے گھبرا جاتا
ہے ۔ مجموعہ کی آوازیں — میں پھر پیدا ہونگا میں
ہر ہندوستانی کی قوت میں پھر پیدا ہونگا جو تمہارے
خلاف جنگ کریگا تم جہاں کہیں بھی ہندوستان میں جاؤ
کلکتہ میں اور بمبئی میں مدراس میں اور کراچی میں تم مجھے
ہر جگہ پاؤگے — تم مجھے مٹا نہیں سکتے (جاپانی سپاہی
لوٹ جاتے ہیں) میں ہرگز نہیں مرونگا —

"پردہ" (بلا ترجمہ)

لاش

شاطر حکیمی

یہ اندھیری رات بادل کی گرج بجلی کا زور ۔
یہ ہوا پانی یہ سناٹا یہ وحشت الاماں ۔
ہوکنا کتوں کا اس پر مینڈکوں کا شور سخت ۔
ہاں مگر بیدار ہے ایک عورت بد نصیب ۔
ہر طرف سے ہو رہے ہیں غم کے حملے بے پناہ ۔
ایک دل وہ بھی سو سو آفتوں میں مبتلا ۔
چاند سے چہرے پہ غم کی چھا گئی ہیں بدلیاں ۔
ہو چکی ہے حسرت و ارماں کی آبادی اجاڑ ۔
واردات مرگ سے قلب و جگر ہیں پاش پاش ۔
ایک مٹکا اور اس پر ایک مٹی کا گلاس ۔
الگنی کپڑوں سے خالی اور چولھا آگ سے ۔
طاق میں رکھا ہوا ہے ٹمٹماتا سا دیا ۔
صحن میں کچا مکان بوسیدہ چھت کمزور سی ۔
یوں اداسی ٹپکتی پڑتی ہے در و دیوار سے ۔
سوچتی ہے ۔ دل ہی دل میں ہائے اب میں کیا کروں ۔
پست ہو کر رہ گئے ہیں اس طرح سب حوصلے ۔
مرنے والا جینے والے کے لئے ہے اک عذاب ۔
آئے دن ایسے مناظر دیکھتا رہتا ہوں میں ۔
گائے باجے پر لڑے مرتے ہیں اب تک ناگہاں ۔
لطرتاً انسان کو خود دار ہونا چاہئے ۔
غیر کے ٹکڑوں پہ کب تک انحصار زندگی ۔
مرد بنتے ہیں تو زنجیر غلامی توڑ دیں
بے حسی کی زندگی سے موت بہتر ہے کہیں ۔

موت کے ہاتھوں میں گویا زندگی کی باگ ڈور
جیسے کوئی وقت آخر لے رہا ہوں ہچکیاں
آج بھی سوئے ہوئے ہیں سونے والے شاہ بخت
شہریوں کی چھاؤں تک سے دور گاؤں کے قریب
نرم ہونٹوں پر تبسم کے عوض بے سرد آہ
دیدۂ تر پیش کرتے ہیں سماں برسات کا
فصل گل جاتی رہی رخصت ہوئیں رنگینیاں
آ پڑا ہے ٹوٹ کر سر پر مصیبت کا پہاڑ
سامنے رکھی ہوئی ہے بے کفن شوہر کی لاش
جو کے کچھ دانے پڑے ہیں اوکھلی کے آس پاس
ایک روٹی بچ گئی ہے جانے کس کے بھاگ سے
ٹوکری میں کچھ نہیں دو چار برتن کے سوا
اے تجھے اللہ سمجھے مفلسوں کی زندگی
جیسے نامعلوم سی دل میں خلش ہونے لگے
ایسی حالت میں کہاں جاؤں کسے آواز دوں
جیسے کوئی عہد و پیمان محبت توڑ دے
اب نہیں آیا تو کب آئیگا آخر انقلاب
صاف لفظوں میں تجھی کو اے وطن کہتا ہوں میں
حیف ہے تجھ پر تری اولاد پر ہندوستان
زندگی سے بر سر پیکار ہونا چاہئے ۔
سعی پیہم کا نتیجہ ہے نشاط سرمدی
ورنہ آزادی کے افسانے سنانے چھوڑ دیں
حشر تک سوتے رہیں گے اب اگر جاگے نہیں

غزل — میر مقبول الحسن آثر

جہاں بیٹھے مقامِ دل سمجھ کر
اٹھایا درد نے غافل سمجھ کر
تیری نظروں کی باتیں سن رہے ہیں
ہم اپنی داستانِ دل سمجھ کر
نقاب اپنی ہی ہستی کا کسی نے
اٹھایا پردۂ محمل سمجھ کر
جو ملتا ہے کہیں ساغر کا ٹکڑا
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر
ہٹا لو دیر و کعبہ راستے سے
میں دھوکہ کھا گیا منزل سمجھ کر
وہیں سے گمرہی پیدا ہوئی ہے۔
رکے تھے ہم جہاں منزل سمجھ کر
آثرؔ غم بھی نوازش ہے کسی کی
رکھا ہے درد ہی کو دل سمجھ کر

دوست سے — کمال احمد صدیقی

خشک ہونٹوں پہ ہنسی آئے تو کیسے آئے۔
خانۂ غم میں خوشی آئے تو کیسے آئے۔
نالہ جو دل سے نکلتا ہے وہ بو دیتا ہے۔
ہر گھڑی آنکھ میں اے دوست ترا نقشا ہے۔
اپنے جذبات پہ رہتا نہیں میرا قابو۔
کیا قیامت ہے کہ روکے نہیں رکتے آنسو۔
آتشِ شوق میں اپنی ہی جلا کرتا ہوں۔
ایک کھوئی ہوئی دنیا میں رہا کرتا ہوں۔
ایک دریا ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔
ایک طوفان ہے کہ امڈا ہی چلا آتا ہے۔
تو اگر چاہے تو مشکل میری آسان کر دے۔
میرے ارمانوں کی محفل میں چراغاں کر دے
قافلہ حسرتوں کا دل میں مرے مہماں ہے۔
مصحفِ رخ تیرا آنکھوں میں مری رقصاں ہے۔
دل مردہ میں ہے اب حسرت و حرماں کا ہجوم۔
جن سے بستی میں مرے دل کی رہا کرتی تھی دھوم
آرزوؤں کا اک ہیجان لیے بیٹھا ہوں۔
مذہبِ عشق کا قرآن لیے بیٹھا ہوں
اپنے ارمانوں کا خون اب نہیں دیکھا جاتا
ان تمناؤں کا خون اب نہیں دیکھا جاتا۔
تو جو چاہے تو مرے دل کو قرار آجائے۔
میری امید کے گلشن میں بہار آجائے

پیڑ کے پتّے

(ہندی سے) ـــ امجد یوسف زئی

سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ سنسان کچی سڑک گھومتی ہوئی چکر کھاتی گویا اس کے پاس سے بل کھا کر نکل گئی تھی۔

نہ جانے کتنا پرانا تھا۔ پیپل کا درخت۔

دیہات کے اس سونے پن میں اکیلا ہی اپنی شاخیں پسار یکساں فضا کی طرف سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن دو نوجوان چہرے پیڑ کے پاس آگئے۔ آگے آگے مرد۔ نوجوان۔ تانبے کا سا رنگ۔ کھادی کے کرتہ میں چمکتا ہوا سینہ۔ آنکھوں میں ہنسی، ماتھے پر ٹیکہ پیر میں نیا جوتا کندھے پر گٹھڑی۔

پیچھے پیچھے لمبی گھونگھٹ لٹکائے ہوئے ایک نوخیز۔۔۔ مہندی میں رنگے ہاتھ۔ گوٹے دار دھوپ چھاؤں کا لہنگا ریشم کی اوڑھنی ـــ تازہ بیاہی بہو کو وداع کرا کے لا رہا تھا کڑاکے کی دھوپ تھی۔ ہولی بیت چکی تھی۔ نوجوان نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ذرا دم لے لیں تو چلینگے۔ کیوں؟

اس کی چمکتی آنکھوں نے گھونگھٹ چھید کر دلہن کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

عورت درخت کے پیچھے آڑ میں چلی گئی۔ اور آہستہ سے مسکراتا ہوا نوجوان بھی پیچھے سے ـــ

کچھ منٹ بعد ـــ

نوجوان کی گود میں لیٹی ہوئی نوشابہ نے حجاب سے سرخ چہرے کو اوپر اٹھایا۔ آہستہ سے بڑی بڑی آنکھیں کھولیں دیکھا۔ "دو امرت بھری آنکھیں"۔ اور پیپل کے ننھے ننھے خوبصورت پتے جو مستانہ وار ہواؤں میں ہل رہے تھے۔

کتنے ہی دنوں بعد ایک ادھیڑ مرد اور ایک عورت دوپہر کو درخت کے پاس آئے۔

مرد تھکا سا۔ جھلایا سا۔ کندھے پر کے بچہ کو لاپروائی سے اتار کر بیٹھ گیا۔ عورت بھی بیٹھی تھی۔ گود میں دوسرے بچہ کو لٹا کر۔

"اری اب بیٹھی ہی رہو گی۔ خاوند نے جھلا کر کہا۔ کچھ کھانا وانا بھی دو گی۔

عورت نے بے رخی سے کہا۔

تم ہی گٹھڑی سے نکال لو۔ دیکھتے نہیں منوا کو۔۔۔

بس بات بڑھ ہی تو گئی۔

ایک سے دو۔ دو سے تین بچے ہو گئے۔ عورت کو بھی۔۔۔۔ لیکن اس کے منہ سے نکل گیا۔

"جیسے ہاتھ پینے کو ملتے ہیں۔ ایسے ہی اگر کمانے کو۔۔۔ بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ایک زور کا ہاتھ لگا۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ بیہوش ہونے پر سر بھاری۔ بدن میں

درد۔ آنکھیں جلتی سی۔ ان جلتی آنکھوں نے دیکھا۔
پیپل کے پیلے روکھے پتے ہوا سے ہل رہے تھے۔
کھڑ کھڑ کھڑ۔۔

بہت دنوں بعد دوا سے چلی آ رہی تھی وہ۔
لڑکھڑاتی۔ مردہ سی۔ اوڑھنی تار تار۔ بال الجھے
ہاتھ پیر لکڑی۔

ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ پتی کو جیل ہو گئی کام ملتا ہی نہ تھا۔ سر مارتے مارتے آخر اس نے وہی کیا جس کا کرنا گناہ ہے۔ چوری۔۔۔ اس سے بھوکے بچوں کا پیٹ بھرا۔ مگر ایک دن وہ پکڑا گیا۔

پھر۔۔۔ جیل۔۔۔

اور پھر بچے بھی چلے گئے۔ بھوکے کے گھر میں کہاں بچ سکتے ہیں۔ آج وہ بھی نکل پڑی تھی۔

اسے جانا ہی ہوگا۔

کہاں؟

جہاں بھی جائے۔

درخت دیکھ کر پیر نہ اٹھ سکے۔ دھم سے آ کر بیٹھ گئی۔ لیٹ گئی۔ گرمی یا دھوپ یا دونوں سے چکر آ گیا
یکایک دیکھا۔

اس کی گود میں سر۔ ہنستی آنکھیں اور۔۔۔ اور
۔۔ بچوں کی لڑائی۔۔۔ آپس کی لڑائی اور۔۔
۔۔۔ اس کی آنکھیں کھلیں۔ ڈوبتی سی۔ کھوئی

شاید آخر بار دیکھا۔
۔۔ پیپل میں ایک بھی پتہ نہ تھا۔ ٹھنٹھ تھا۔
پت جھڑ کی ہوا چل رہی تھی۔ ہو۔ ہوں۔۔۔۔
اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے کانوں کی ہو۔
ہو۔ بھی بند ہو گئی۔ (ترجمہ از ماہنامہ ہنس ہندی)

تقابل

صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کیلئے

سحر ہو گیا شاید سوز قلب پروانہ
آج شام ہی سے کیوں شمع جھلملاتی ہے

ماہر القادری

آدمی کی ہستی کیا بلبلا ہے پانی کا
جس کے ہر ارادے پر موت مسکراتی ہے

میر مقبل الرحمٰن اختر (حیدر آبادی)

پھول پھول ہنستا ہے شاخ شاخ گاتی ہے
تم چمن میں آتے ہو یا بہار آتی ہے

سید حسن حیرت (بدایونی)

رقاصہ

از سلمیٰ راشد
مہندی

کھڑڑ۔ کھٹ۔ کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی۔ سارے بیچ کیچے ہوٹل اور ناچ گھر بند ہو گئے ہونگے۔ کوئی بھی بھلا آدمی اس وقت اپنے گھر سے نکلنا گوارا نہ کریگا

... آخر کون...... وہی پاگل ہوگا۔ لیکن سارنگی۔ اور پھر اس وقت کیوں آیا ہوگا۔ کیا کام۔ بری طرح پاگل ہو رہا ہے بے چارہ

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے چہرے سے ریشمی چادر جو اس کے جسم کے ہر حصے کو ملفوف کئے تھی۔ پرے ہٹائی۔ جانے آج اسے نیند بھی کیوں نہیں آ رہی تھی

اس نے پلنگ سے پیر نیچے اتارے اور اٹھکر سوئچ دبا دیا۔ سارا کمرہ بجلی کی روشنی سے منور ہو گیا۔

دوسری بار پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ اور کسی نے جھنجلا کر خشک اور موٹی آواز میں کہا۔

"کھولو بھی......

"ارے؟... یہ کون... نہیں یہ پاگل نہیں ہو سکتا اسکی آواز تو اتنی بھاری فوجیوں جیسی ہے۔ آخر کون فوج سے بھاگا ہوا سپاہی۔ لیکن برمی زبان جانتا ہے۔ یونہی ٹوٹی پھوٹی۔ کتنا بھدا لہجہ ہے۔ بات کا انداز بھی کسی غراتے جانور کی سی ہے۔

خیالات کی رو میں بہتی ہوئی وہ دروازے کے قریب پہنچی۔ ایک نہ معلوم جذبہ کے تحت اس کا ہاتھ اوپر کو اٹھا اور اس نے چٹخنی گرا دی۔

ایک جھٹکے کیساتھ دروازہ کھلا ہوا کا ایک سرد سرد جھونکا اندر گھس آیا۔ ساتھ ہی ایک جھومتا ہوا۔ فوجی اندر داخل ہوا۔ اس کے گھنے تر چھے ابرؤوں کے نیچے بھاری پلکوں والی نیم وا آنکھیں چمک رہی تھیں بھدی بدوضع اور چپٹی سوروں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ناک تھی۔ بھدا سا ہونٹ نیچے کی طرف لٹکا تھا منہ اس کا تھوڑا سا کھلا تھا۔ جس میں سے اس کے پھیلے ہوئے پیلے پیلے دانت صاف طور پر نظر آ رہے تھے اور ٹھوڑی تو جیسے کسی نے نیچے کو ہی بٹھا دی ہو۔ جسم پر فوجی وردی تھی۔ ٹوپی پر نکلتے ہوئے سورج کی تصویر چسپاں تھی۔

ایک لمحہ کھڑے رہ کر اس نے طوائف کے اٹھتے شباب کی رعنائی کو دیکھا۔ اور کیسقدر مسکرایا۔ ارے.. جاپانی۔ کیوں...... ایک نامعلوم خطرے کی کیفیت اس کے نازک دل پر طاری ہو گئی وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ایک سہمی ہوئی کبوتری کیطرح۔ فوجی نے اندر آکر دروازہ کی چٹخنی بند کر دی۔ اور سیدھا جا کر ایک آرام کرسی پر اس طرح دراز ہو گیا۔ جیسے وہ گھر اسی کا تھا۔ اپنا تمغے لگا ہوا فوجی کوٹ اتارتے ہوئے اسکا

زیر لب کہا۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ جھنگ جھنگ۔ اور پھر جھنگ۔ جانوروں کی طرح جب دیکھو آدمیوں کی نوہ میں گھوم رہے ہیں۔ نہ ناچ نہ گانا۔ اور نہ ہی شراب کبھی میں اپنے ملک میں تھا۔ . . . پھر طوائف کی طرف للچائی نگاہوں سے دیکھا جو ابھی تک دروازہ سے چپکی کھڑی تھی۔

"ارے تم وہاں کیوں کھڑی ہو۔ یہاں بیٹھو۔ ادھر۔ . . . . .

یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ دوسری کرسی پر لاپرواہی سے پھینک دیا۔

طوائف نے ڈرتے ڈرتے اپنی زبان کھولی۔

"لیکن دو بجے کے بعد۔ . . . . "

"تم بھی کمال کرتی ہو۔ دو بجے کے بعد" ہونہہ اس نے اپنا فولادی ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ذرا سوچو بھی تو کہ ہم تمہارے بتائے ہوئے وقت کی پابندی کیسے کر سکتے ہیں جب سے اس مورچہ پر آیا ہوں تمہارے حسن جانسوز کی شہرت سن رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے تو آج آسکا ہوں۔ اور اس پر بھی تم کہتی ہو کہ دو بجے کے بعد۔ کم از کم تم تو اس قدر ظلم نہ کرو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم اپنے چاہنے والوں کا خیر مقدم ہی کرنا نہیں جانتیں۔ سوچو نا —— ہماری فطرت کا اندازہ کرو۔ کہ اتنی دنیا پار کر کے تمہیں آزاد کرانے آئے ہیں۔ سیروں لہو بہایا۔ مگر۔ تم۔ . . . .

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے نوٹوں اور سکّے روپوں کا بٹوا نکالا اور اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر رقاصہ کے حسین چہرہ پر نظریں گاڑے اس کے حسن دلکش کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔

طوائف کپڑے تبدیل کرنے دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔ گو وہ کپڑے بدل رہی تھی۔ مگر جھنجلاہٹ کا جذبہ بار بار اس کے چہرے پر نفرت و حقارت کے آثار پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ کہنے لگی۔

"دوست ہیں اتنی دور سے آئے ہیں بیچارے . . . . نہ معلوم کیا سمجھ لیا ہے۔ جب جی چاہا گھس پڑے . . . اس پر حکم تو دیکھو۔ رات بھر ناچو گاؤ۔ اور سوؤ کب پھر۔ آج اس فوجی کے مارے کل کا سارا دن بھی خراب ہوگا۔ اگر انکار کرو تو ظلم کا پہاڑ سر پر ٹوٹ جائے۔ پٹرول میں ڈبا کر آگ لگادیں جسم میں سوئیاں چبھوئیں۔ ننگی کر کے سڑکوں پر گھسیٹیں۔

اُف۔ یہ ظلم اور دوستی کا وعدہ۔

اس کی نرگسی آنکھوں کے سامنے اس کی ایک سہیلی کی تصویر پھر گئی۔ جس نے کہہ دیا تھا کہ "یہ وقت گانے کا نہیں ہے"

بس پھر اس پر انہوں نے اس کی بڑی بڑی غلیلی آنکھوں کو سوئی سے پھوڑ ڈالا تھا۔ کیسی بھیانک لگتی تھیں۔ وہ آنکھیں —— چھولی پھولی۔ خون سے تر بتر

اور روشنی سے بیگانہ — منہ پر کس قدر ہنٹر مارے تھے۔ پھر اِس پر اکتفا نہیں کی۔ سب کو بلا کر اس کے بدوضع چہرہ اور جسم کو دکھلایا۔ اور سب کے سامنے اس قدر بے رحمی سے ہنٹر مارے کہ بے چاری کے جسم کا بند بند ٹوٹ گیا۔ اور پھر سب جاپانیوں نے . . .

اس کا تمام جسم کانپ اُٹھا۔ لرزیدہ ہاتھوں سے اس نے بجلی کا بٹن لگایا۔

— بے چاری رات بھر کیسی کیسی چیخی۔ چلائی — اور صبح کے وقت سوکھی سوکھائی۔ برہنہ جسم سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔ اس کے دونوں ٹخنوں اور ہاتھوں کو انہوں نے مٹی کے تیل میں بھگو کر آگ لگا دی تھی۔ اور وہ ظالم کھڑے اس کا چیخیں مار مار کر سارے گھر میں بھاگنا اور تڑپنا دیکھتے رہے تھے۔ اس کی حالت کرب پر قہقہے لگاتے اور کہتے۔

"کیا اچھا ناچ ہے"

اور جب وہ بیہوش ہو کر گر گئی۔ تو ان کے فولادی ہاتھوں نے اُسے باہر پھینک دیا . . . . اس نے الماری بند کی اور قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگی جس میں اس کا مرجھایا ہوا آزردہ چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اور اس کا سڈول نازک جسم تھرتھرا رہا تھا۔ بالوں میں کنگی پھیرتے ہوئے اس نے سوچا۔

"میں بھی اگر انکار کر دوں تو۔ یہ تو صرف تنہا ہی ہے — کیا کر لیگا۔ پیچھے کی طرف سے بھاگ جاؤں۔ مگر چھپونگی کہاں — پاگل . . . .

اوہ — میرا پاگل — وہ تو میری دل و جان سے حفاظت کریگا۔ مگر یہ . . . . یہ فوجی تو میرے سارے گھر ہی میں آگ لگا دے گا۔ پھر — اگر پکڑی گئی تو یہ ظالم بھی اسی طرح میری کہنیوں اور ٹخنوں میں تیل لگا کر . . .

اس سے زیادہ وہ نہ سوچ سکی۔ اس کا چھریرا بدن خوف و دہشت سے تھرتھر کانپنے لگا۔ چمکتے ریشمی ملبوسات سے آراستہ وہ کمرہ سے نکلی۔ افسر سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ہوا کھڑکیاں کھول رہا تھا۔ رقاصہ نے اپنے گداز جسم کو ہلاتے ہوئے مخصوص لہجہ میں جو وہ اپنے ہر نئے شکار کی آمد پر اختیار کیا کرتی تھی کہا —

"کہیئے"۔ اور پھر فوجی کی طرف دیکھکر ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

شراب۔ بس صرف شراب اور تم۔ فوجی نے تھوڑا سا پیچھے مڑ کر کہا ایک فوجی فلم جو اسے چین کے مورچے پر دکھلایا گیا تھا بالکل اسی طرح اُسنے محبت آمیز لہجہ میں یہ الفاظ ادا کر کے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

طوائف نے اپنے نرم و نازک جسم کو اس کے آہنی بازوؤں میں دیدیا۔ فوجی کی خونی آنکھوں سے ہی اُسے ڈر لگتا تھا اور اب . . . نہ جانے کتنے ہی خوف و نفرت کے طوفان اسکے نازک دل میں موجزن تھے۔

"جاپانی . . . کیا یہ بھی کوئی انسان ہیں۔ جو آدمیوں کو زندہ مسل ڈالتے ہیں۔ کسی زہریلے کیڑے مکوڑوں کی طرح۔ کھیتوں میں آگ لگا دیتے ہیں۔ عورت اِن

کے نزدیک ۔ ناچنے گانے اور شراب پلانے والی ایک پتلی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ۔ جب ان کا اشارہ ہو اس کے جذبات میں طوفان پیدا ہو حسن کی دلکشی نکھر کر رنگینی بن جائے تاکہ یہ مرد اپنے تشنہ جذبات کی آگ بجھانے کے لئے اس کے جسم کے کسی حسین حصے کو چوم لینے کی خواہش کریں ۔ اور بدنصیب عورت فوراً ہی ان کے فوری پیدا ہونیوالے جذبے کے آگے اپنا سب کچھ پیش کر دے ۔ اپنی روح اور ضمیر کو صرف اس بھٹکے ہوئے مرد کے جذبات کیلئے وقف کر دے .....

کہ نہ اس کا ضمیر ہے نہ دماغ ۔ یہ صرف ناچنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے ۔ بلکہ یہ جیسا کہیں ویسا ناچو ۔ جس کل یہ بٹھائیں اسی کل بیٹھو ۔ ہمارے چار چار سال کے معصوم بچوں کو پکڑ لیتے ہیں ۔ ان کا خون کھینچ لیتے ہیں آہ یہ ظلم ۔

" کیا اسے مار ڈالوں ۔ شراب میں زہر ملا کر ۔ لیکن فوراً ہی افسر کی سرخ سرخ ہو گئی اور ظالم آنکھیں اسکی نگاہوں میں پھر گئیں ۔ اور وہ کانپ اٹھی ۔

اس نے الماری میں سے بوتل نکالی ۔ پیالے نکالے ۔ اور ایک زہریلی پڑیا بھی ۔

" ملا ہی دوں ۔ اس نے ایک بار ارادہ کیا مگر ہاتھ کانپ رہے تھے ۔ ایک لمحہ بھر تک وہ پڑیا کو تکتی رہی اسکی نظروں کے سامنے پڑیا تھی ۔ الماری تھی ۔ اور اس میں رکھی ہوئیں شراب سے لبریز رنگین بوتلیں ۔ مگر جیسے اسے کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا ۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ مگر بیکار ۔

" ان روزانہ مرنے والے لوگوں سے میرا بھی تو کچھ تعلق ہے " ۔ مگر ایک کو مار ڈالنے سے کیا فائدہ ۔ ابھی تو ایسے لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں بسے پڑے ہیں ۔ اور پھر وہی کپکپاہٹ اور فوجی افسر کی لال ہوئی آنکھیں اس کے دل و دماغ پر مہیب تاریکی کی طرح چھا گئیں ۔

جاپانیوں کا ظلم و تشدد ۔ اپنی بیکسی اور چند چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کی لالچ ۔ ان تینوں نے ملکر رقاصہ کے خیالات میں الجھن سی پیدا کر دی اسنے پڑیا ایک طرف پھینکدی ۔

" آخر مجھے بھی تو زندہ رہنا ہے ۔ اور پھر ان برمیوں نے ہی میرے لئے کیا کر دیا ۔ در در کی ٹھوکریں ۔ اور جہالت ۔ اس کے لرزیدہ قدم فوجی افسر کی جانب اٹھنے لگے ۔

دل میں طوفان سا اٹھ رہا تھا ۔ خیالات کی رو بہتے بہتے کہاں جا پہونچی ۔ بچپن کا تصور اس کی آنکھوں میں گھوم گیا ۔ کیسے اس نے اپنی عمر کے ابتدائی دس سال اسی شہر ۔ اسی سماج اور انہیں لوگوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے گذارے ۔

دروازوں پر اسے کیسی کیسی دھتکاریاں سہنی پڑیں تھیں ۔ کس طرح موسلا دھار بارش ۔ اور آتش فشاں گرمی میں وہ اپنے پیٹ کیلئے ۔ صرف چار دانوں کے

واسطے پیدا کرتی۔ پھر۔ ماں کے مرنے کے بعد کیسے ایکدن ایک بڑھیا بہکا پھسلا کر یہاں لے آئی اور اسے ناچ گانا سکھا کر اس نے کتنے روپے حاصل کئے۔ مگراب۔ اس خیال سے طوائف کے چہرہ کی رعنائی اور بڑھ گئی۔

اس کے پاس حسن ہے شباب ہے۔ بے پناہ دولت ہے۔ اب وہ ایسے ہزار ہا۔ فقیروں کو روز دھتکارا کرتی ہے۔ × × × × × × × × × × ×

وہ جاپانی افسر کے پاس تھی۔ اور وہ بھی اس کے حسن دلکش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ناگن کی طرح لہرا کر طوائف نے اپنا ایک ہاتھ فوجی کے گلے میں ڈال دیا۔ اور دوسرے سے شراب بھر بھر کر پلانے لگی۔ فوجی کے مجبور کرنے پر اسے بھی شراب پینی پڑی۔ افسر کی خونی آنکھوں میں اب بجائے ظلم و تشدد کے طمانیت نمایاں تھی۔ ہاتھوں کا کھردرا پن اور چہرہ کے سلوٹیں نہ تھیں مسلسل شراب سے دونوں پہ مدہوشانہ کیفیت طاری ہوگئی۔

فوجی نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ تو چاندنی رات تھی۔ ٹوٹے گرے اور جلے کھنڈروں پہ چاند اپنی سنہری کرنیں بڑی ہی فیاضی سے بکھیر رہا تھا۔ وہ پھر ہی طرف ننگی پہاڑی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ اس نے سوچا کتنا اچھا سماں ہے بالکل اسی رات کی طرح۔ شراب وہی گانا

لیکن جب وہ چینی لڑکی ایک چوسے ہوئے آم کی طرح تھی۔ اب تو اور بھی مزا آئے گا.....

اس نے طوائف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلو اس سامنے والی پہاڑی پر چلیں۔ وہیں پینگے یہ شراب۔ پھر گانا بھی ہوگا۔ کتنا لطف آئیگا.....

ایک بار میں نے ایک چینی لڑکی سے بھی ایسے ہی پہاڑ پر گانا سنا تھا۔ لیکن اب تو شراب بھی ہے اور پھر کہاں وہ اور کہاں تم۔

اٹھو چلو چلیں ــــ اس نے طوائف کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور کوٹ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

طوائف تھوڑی دیر کیلئے سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر رک کر اس نے کہا۔

"نہیں میں وہاں نہیں جا سکتی"۔

فوجی کی آنکھوں کا رنگ فوراً ہی بدل گیا۔ وہی لال لال انگارے جیسی غضب آلود آنکھیں تھیں۔

وہ سہم گئی۔ سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگی اس نے بہت کچھ چاہا کہ کچھ بھی ہو مگر وہ کٹھ پتلی نہیں بن سکتی۔ نہیں وہ اس جاپانی کیساتھ وہاں نہ جائیگی۔

"یہاں کیا برا ہے وہاں ناچ نہ ہو سکے گا" اس کے کانپتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں سے بالآخر نکل ہی گیا۔ اس نے فوجی کو رام کرنیکی بہت کوشش کی مگر بیسود۔

بچپن سے اسکی امیدوں اور حسرتوں نے محبت بھرے جملوں کے نیچے دب دب کر چند چاندی کے کھنکھنے

سکوں پر سے پھسل پھسل کر اور منہ پر لائی ہوئی مصنوعی مسکراہٹ
میں چھپ چھپ کر اپنا ضمیر دوسروں کے لئے وقف کردینا
سیکھا تھا۔ وہ انکار نہ کرسکی۔ افسر کے تیور دیکھکر اسے
جھک جانا ہی پڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ایک نئے جذبے
کے تحت ..... کتنے روپے ... کتنی بہار ...

وہ دونوں جا رہے تھے۔ اس لمبی چوڑی سڑک
پر سے جو گولہ باری کی مسلسل بارش سے ٹوٹ پھوٹ
کر مبہم نشان کی طرح بے ترتیب پڑی تھی۔ آسمان پر
چاند بالکل ساکت تھا۔ پاس سے گذرنے والے مسمار
شدہ مکانات۔ ٹوٹے ہوئے چھجے اور سڑک کے گہرے
گہرے گڑھے۔ جیسے اپنی بے بضاعتی و بے بسی پر آنسو
بہا رہے تھے۔ سڑک کے ایک طرف چھوٹے چھوٹے بچوں کی ننگی
لاشیں پڑی تھیں۔ جنکے فاقوں اور ظلم سے مرجھائے چہرے
پکے آم کی طرح پیلے پڑ گئے تھے۔ ان میں سے بعض کی
ننھی ننھی ہتھیلیاں اور چہرے خون سے لت پت ہو رہے
تھے۔ قریب ہی بڑی لاشیں بھی تھیں۔ جو جلکر بالکل سیاہ
پڑ گئیں تھیں۔

طوائف ایک کچلے ہوئے سر کے پاس سے گذری
، وہ کانپ اٹھی۔ جلی بوسیدہ لاشوں کے ڈھیر سے دماغ
کو پھاڑ دینے والی بدبو نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی
کسی نے انہیں پرے تک بھی نہ ہٹایا تھا۔ اسے یوں
محسوس ہوا جیسے ابھی لمحہ بھر کے بعد یہ ٹوٹے ہوئے مکانات
لاشوں کے ڈھیر اور غار نما کھنڈرات اور ننگی لاشیں

پھر سے ایک بار گرجتی ہوئی اٹھینگی اور ان ظلم و
تشدد کی بنیادوں کو ہلا دینگی۔ طوائف نے جس
نے کبھی اپنی عمر میں سجی ہوئی ہوٹلوں اور امیروں کے
عشرت کدوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ یہ خون
ریز منظر دیکھکر بے تاب ہو گئی۔ مظلوموں کی کہانیاں
صرف اس نے زبانی ہی سنی تھیں۔ لیکن آج ان
کہانیوں کی حقیقت دیکھ کر اس کے سارے خفتہ جذبات
جاگ اٹھے۔ وہ چلا چلا کر کہنا چاہتی تھی۔

"کمینو۔ برما کو برباد کر ہی دیا۔ آخر تم نے محبت
کا جامہ پہنکر خونی بھیڑیو دوستی کا دم بھرتے ہو۔
لاکھ میں گنہگار سہی۔ سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ
سہی۔ ایک بیسوہ جو کچھ بھی سہی مگر جاپانیوں تمہیں کیا
حق حاصل تھا۔ کہ برما کو برباد کرتے۔ کیا ہم برباد
ہونے اور غلام ہی رہنے کیلئے ہیں؟ ہمارے سینہ پر
خون کی ہولی کھیلی جائے اور ہم بے بس بنے صرف
دیکھا ہی کریں۔ ایک گیا دوسرا آیا۔ اور ہم جیسے
کچھ بھی نہیں۔ برما میں آنے سے پہلے کیسی میٹھی میٹھی
باتیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ برما "ہندوستان
کا ایک آزاد خطہ ہے"۔ کیا یہی ہے وہ آزادی۔۔
... اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی سپنا
دیکھ رہی ہے۔ سڑک پر اپنے جسم کی کالی کالی پر
چھائیں دیکھکر وہ چونک سی گئی۔
فوجی نے اس کے نازک کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

اور ڈانگنگ کے انداز میں کہنے لگا۔

میں نے ایسی ایسی چیزیں دیکھی ہیں جو دوسروں کو نصیب نہیں ۔۔۔ اور پھر وہ چینی مورچہ کی کوئی کہانی سنانے لگا۔ کہ کیسے وہ غلام عورتوں سے فرصت کے لمحات میں اپنا دل بہلایا کرتے ہیں۔

سڑک کے دوسری طرف ایک اور انسانی جسم پڑا تھا۔ جس کے بغل میں کوئی لانبی سی چیز دبی ہوئی تھی۔ طوائف کی نظر اس جسم پر نہیں پڑی۔ وہ اپنے خیالات میں محو تھی۔ فوجی نے اسے بتایا۔

"دیکھو یہ بھی ایک پڑے ہیں۔ جو ہمارے شہر میں رات کو سارنگی بجاتے ہوئے گھوما کرتے تھے۔ شہر جیسے ان کے باپ کی میراث ہی تو ہے۔ میں نے جو اپنے جوتے کی ایک ٹھوکر ماری تو بس چت سی ہو گئے۔

"سارنگی" طوائف نے چونک کر پوچھا۔ اس کے خمیدہ ابروؤں میں بل پڑ گئے۔ وہ تیزی سے لاش کے قریب گئی۔

"ہائیں۔ کیوں ۔۔ کوئی جاسوس ہو گا۔ فوجی نے کسی قدر لاپروائی سے کہا۔ اور ایک فاتحانہ چال سے طوائف کے پیچھے آیا۔ طوائف نے دیکھا لاش کا منہ بری طرح کچلا ہوا ہے۔ آنکھیں باہر کو نکلی پڑی ہیں جیسے متحیر ہوں۔ وہی قمیض تھی ۔۔۔ جو اب خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سچ مچ وہی ۔۔۔ سارنگی اسکی بغل میں دبی ہوئی تھی جس کے تاروں پر ابھی چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔

طوائف کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ اس کے لرزیدہ پاؤں کسی قدر پیچھے ہٹے۔

"ارے ڈر گئی کیا" ۔۔ فوجی نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"پاگل ..... پاگل ...... پریتم .... موت ... آہ ... طوائف کے دماغ میں آندھی سی چل رہی ہے۔ اس کا ہاتھ فوجی کے اوورکوٹ کی جیب میں تھا اس کے پتلے پتلے نازک ہاتھوں میں کوئی چیز چمکی ... ہائیں ۔۔ ہائیں۔ اُف ... آہ ... اور پھر لال نیلی روشنی لمحہ بھر کیلئے چمکی۔

x x x x x x

ہاتھ میں سارنگی لئے۔ سکڑتی۔ سہمتی چھپتی چھپاتی ایک لڑکی گلیوں میں سے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس کے چہرہ سے گھبراہٹ و بے چینی کے آثار ہویدا تھے۔ اور ہونٹوں پر پاگلوں جیسی بے معنی ہنسی دوڑ رہی تھی۔ (سندھی سے ترجمہ)

علامہ شبلی نعمانی

سید سبط حسن

مولانا شبلی نعمانی مئی ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانے میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ اور غازی پور میں پائی۔ پھر تحصیل علم کے شوق میں لکھنؤ، رامپور، لاہور اور سہارنپور کا سفر کیا۔ کچھ دنوں وکالت اور سرکاری ملازمت بھی کی۔ لیکن ان کاموں میں جی نہ لگا اور اپنے آپ کو علمی اور قومی کاموں کیلئے وقف کر دیا۔

جس زمانے میں مولانا شبلی تعلیم سے فارغ ہوئے اتحاد اسلام کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس تحریک نے مولانا کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ اگر مسلمان متحد اور بیدار نہ ہوئے تو مغربی شہنشاہیت ان کی رہی سہی عظمت بھی مٹا دیں گی۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی تو مولانا نے اعظم گڑھ سے تین ہزار روپیہ ترکی بھیجا۔

جنوری ۱۸۸۳ء میں مولانا شبلی علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے مددگار پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور تقریباً سولہ برس تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان دنوں علی گڑھ ہی تعلیم کا سرچشمہ، قدیم و جدید کا سنگم اور مسلمانان ہند کی قومی بیداری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسی ماحول میں مولانا کو پہلے پہل مسلمانان ہند کی بربادی کا درد اور احساس پیدا ہوا۔ اس احساس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے تمام عمر اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا رخ شملہ کی بجائے قبلہ کی طرف کر دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو شکست خوردگی اور احساس کمتری سے نکالنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ انہیں مسلمانان اسلام کے شاندار کارناموں اور اسلام کی جمہوری روایتوں سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان میں جوش و ولولہ اور حوصلے پیدا ہوں۔ ان کی تمام تصنیفات کا مقصد اور مرکز خیال یہی ہے۔

۱۸۹۳ء میں مولانا نے ترکی، شام اور مصر کا سفر کیا۔ اس سفر نے ان کے خیالات کو اور بھی پختہ کر دیا۔ مولانا شبلی نے تنظیمی کاموں میں بھی پورا پورا حصہ لیا۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ، علی گڑھ کالج، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ندوہ، انجمن ترقی اردو، مدرسہ الاصلاح سرائے میر، اس وقت کی تمام تحریکوں میں مولانا پیش پیش تھے۔ انجمن ترقی اردو کے سب سے پہلے سکریٹری مولانا ہی تھے۔

۱۸۹۸ء میں انہوں نے استعفےٰ دیا اور "الفاروق" کی تصنیف کی۔ مسلمانان ہند کو پہلی بار غالباً اسی کتاب کے ذریعہ خلیفہ اسلام کی دینوی اور دنیاوی عظمت

کا احساس ہوا اور انہیں معلوم ہوا کہ اسلام کی جمہوری روایات کتنی شاندار رہیں۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک مولانا شبلی ریاست حیدر آباد میں سررشتہ علوم و فنون کے ناظم رہے یہیں انہوں نے معرکۃ الآرا کتابیں الغزالی۔ علم الکلام موازنۂ انیس و دبیر اور سوانح مولانا روم تصنیف کیں اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء کے درمیان مولانا شبلی زیادہ تر ندوہ اور اس کی سیاست سے جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی تھی۔ وابستہ رہے یہ زمانہ مسلمانان عالم کی ہادی آزمائش اور جدوجہد کا زمانہ تھا۔ جنگ طرابلس، جنگ بلقان، مسجد کانپور، تعلیم بنگال غرض ایک سیلاب بلا تھا جو امنڈا چلا آتا تھا۔ مولانا نے گو براہ راست سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا لیکن اس زمانے کی قومی نظمیں جو مولانا آزاد کے الہلال میں چھپتی تھیں مسلمانوں کی رگ رگ میں بجلی دوڑا دی۔

اس زمانے میں بھی مولانا اپنے علمی مشاغل سے غافل نہیں رہے۔ انہوں نے شعر العجم لکھی جو ان کا شاہکار ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وفد ۱۹۱۱ء میں شرکت کی ڈھاکہ یونیورسٹی کی تشکیل کی تجویز میں حصہ لیا۔

۱۹۱۲ء میں حیدر آباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کے قیام کی یادداشت تیار کی۔

۱۹۰۹ء میں مسئلہ "وقف علی الاولاد" پر تقریر کرنے کی غرض سے مسلم لیگ کے اجلاس دہلی ۱۹۱۰ء میں شرکت کی اور کئی بار بمبئی کا سفر کر کے مسٹر جناح سے اس بل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ دارالعلوم ندوہ کی اصلاح کی مہم بھی چلاتے رہے۔ اور یہ کثرت تاریخی اور سیاسی مضامین لکھتے رہے۔

۱۹۱۳ء میں مولانا نے ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا اور بمبئی میں رہ کر سیرت کی تصنیف میں مصروف ہو گئے لیکن صحت خراب ہو چکی تھی۔ اگست ۱۹۱۴ء میں عزیز بھائی کی رحلت نے رہی سہی طاقت بھی چھین لی اور مولانا نے دار المصنفین اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ یہ ادارہ انہوں نے ندوہ سے علیحدگی کے بعد قائم کیا تھا۔ اور مولانا نے اسی سرزمین پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو رحلت فرمائی۔

مولانا شبلی کے علمی اور عملی کارناموں پر سرسری نظر ڈالئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک ترقی پسند ادیب ترقی پسند مورخ، ترقی پسند عالم اور ترقی پسند رہنما تھے۔ اور ان کی تخلیق زندگی اور ان کا عمل آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔

تصویر تصور کا ایک ورق

غزل

تصور ابن بدیع

زمیں پر گفتگو ہے آسماں کی
کہاں تک بات پہنچی ہے کہاں کی

خموشی میں بھی قدرت تھی زباں کی
میں صورت دیکھتا ہوں رازداں کی

قفس تک بجلیوں کی ہے رسائی
خبر آئی ہے شاید آشیاں کی

مری آنکھوں میں دل سے آرہے ہیں
ہے گہرائی بہت اشکِ رواں کی

خدا رکھے یہ فرقِ بے نیازی
ہمیں سے ہے تمہارے آستاں کی

بلائیں ختم ہم پر ہو گئیں سب
کوئی صورت نہیں اب امتحاں کی

بدلتے ہیں کبھی جو دل کے تیور
تو نبضیں ڈوب جاتی ہیں جہاں کی

چہار درویش

سلسلہ گذشتہ

سراج رضوی

شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو تو ہمیں عریاں کرنا ہی ہے ۔ پہلے تو یہ احتجاج کرینگی نہیں اور اگر انہوں نے کچھ ہمت کی تو پہلے تعلیم یافتہ خواتین کو سامنے کھڑا کیا جائے گا صاحب! ہیرے کو تو ہیرا ہی کاٹتا ہے ۔ اور اگر کہیں یہ جماعت بھی ہمارے پھندے سے نکل گئی تو طوائفین ہندوستان سے ختم ہونیوالی ہیں نہیں سلامت رہے انکی قوم ۔ ان کو کھڑا کرایا جائے گا ان کا کھڑا ہونا گویا ہندوستان کے کروڑوں نوجوان بلکہ رنگیلے بوڑھوں کا بھی کھڑا ہونا ہے رہ گئیں خود طوائفیں تو یہ شہریں ہماری امت ۔ انہیں کے بل بوتے پہ تو ہم یہ سب کچھ کرینگے ۔ یہ اگر کچھ احتجاج و احتجاج کے دھندے میں پڑ گئیں تو خود آتی ہوئی دولت پر لات مارینگی ۔۔ بحرحال اسکی تو آپ بالکل فکر نہ کیجئے ۔ عورتوں کو اتنی اہمیت ہی نہ دیجئے ۔ یہ تو کھلونا ہیں کھلونا ۔

(تھوڑی دیر تک سب خاموش رہتے ہیں)

چہارم ۔ (سگریٹ گلدان میں بجھاتے ہوئے) مگر .. مگر ہم اس سے قوم کا ایک ناقابل تلافی نقصان کر دینگے ۔

دوم ۔ صاحب! اب آپ قوم کا فائدہ دیکھیئے یا اپنا قوم کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں ہندوستان جا کر فاقہ کیجئے ۔ جیل میں سڑیئے اسکے علاوہ آپ کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ۔ میری بات مانتے ہیں ۔ تو روزانہ وسکی اور شیمپین کی بوتلیں توڑیئے ۔ شباب و حسن کو ہر وقت جیب میں لئے پھریئے ۔ کھایئے ۔ پی جیئے ہنسیئے اور موج اڑایئے ۔

(پھر سب خاموش ہو جاتے ہیں)

اول　　سکوت توڑتے ہوئے " بھائی میں تو دل و جان سے آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں "

سوم　　صاحب میں تو اپنا خون پسینہ ایک کرنے کیلئے آمادہ ہوں ۔

(درویش چہارم خاموش رہتا ہے)

دوم　　(چوتھے کی طرف نگاہیں پھیرتے ہوئے) کیوں صاحب آپ کیا فرماتے ہیں ۔

چہارم　　(مسکراتے ہوئے) صاحب معاملہ نقد نارائن کا ہے ۔ اور آپ جانئے ہم ۔ (ذرا رک کر) جو آپ کہیں ... بھائی ہمارا تو وہ حساب

ہے کہ "خادم پیر مغاں ہوں مست میرا پیر ہے"

دوم (انتہائی مسرت کے لہجہ میں) اسکے معنی یہہ ہوئے کہ آپ لوگ سب تیار ہیں" افراط انبساط میں چیخ کر "بوائے" کو آواز دیتا ہے بوائے گھبرا کر بھاگتا ہوا آتا ہے۔ اور میز کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پریشان نظروں سے سب کو دیکھنے لگتا ہے")

دوم لڑکے جاؤ۔ پیگ ایکشا کے بہت جلد لیکر آؤ۔ جاؤ۔ جلدی جاؤ۔ (خود ہنسنے لگتا ہے اور زور زور سے ہاتھ ملنے لگتا ہے۔)

تھوڑی دیر کے بعد لڑکا چار پیگ لیکر آتا ہے اور ہر ایک کے سامنے ایک ایک رکھ دیتا ہے

دوم (جام اٹھا کر) "ترقی ہند ادب کے لئے" (سب جام اٹھاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے پی جاتے ہیں)

دوم (خالی جام میز پر رکھتے ہوئے تو پھر آپ آیئے ہر شخص اپنے ذمہ ایک ایک کام لے لے" کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ اور درویش اول کیطرف مخاطب ہو کر کہتا ہے

دوم آپ اپنے ذمہ نثر کا کام لیجئے۔ افسانے اور ڈرامے لکھئے اور لکھوایئے۔ اُن افسانوں اور ڈراموں میں آپکو واضح کرنی ہونگی

عورتوں کی قسمیں۔ ان کے مختلف اعضاء۔ اندرونی اور بیرونی بیماریوں کی قسمیں۔ عورتوں کو مرد کے اور مردوں کو عورتوں کے شکار کرنے کے طریقے۔ شرابوں کے ملنے کے خاص خاص مقامات کے نام۔ طوائفوں کے بہاؤ۔ اور ادم کے لئے رکھتا ہے) اور آپ کو بتلانا ہوگا کہ چھتری میں سے کس طرح جھانکا جا سکتا ہے۔ لحافوں میں کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ بیویں کتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں کو کسطرح دیکھیں اور اسپر کمند کسطرح پھینکی جائے محلوں میں عیاشی کے مواقع اچھے ہیں یا جھونپڑیوں میں اور ممتاز کونسی ہے۔ دلی کی طوائف اچھی ہوتی ہے۔ یا پنجاب کی ریلوں میں رومانس لڑانے کے کیا طریقے ہیں۔ اور غسل خانہ میں کیا کیا وارداتیں ہوتی ہیں۔

اول (قہقہہ مار کر خوب۔ خوب۔ بہت خوب ایسا ہی ہوگا۔

دوم " اور ہاں ایک چیز آپ کو روز ایجاد کرنی پڑیگی جسکا نام آپ رکھینگے ادب" لطیف: اُس کا طریقہ یہہ ہوگا

ایک خیال یا واقعہ یا کوئی اور چیز لی گئی
ایک صفحہ کاغذ پر لکھا گیا۔ پھر ہر تین چار
لفظوں کے بعد ایک پانچ۔ دس۔ پندرہ
بیس نکتے ڈالدیئے گئے اور چھپنے کیلئے رسالوں
میں بھیجدیا گیا۔"

اول   جی۔ بہت خوب"

دوم   سوم کی طرف مخاطب ہوکر) اور آپ کے ذمہ
حصہ شاعری ہے جسکا نام جدید شاعری
ہوگا۔ آپکا کام یہہ ہے کہ بہت سارے خیالات
کو چند چھوٹی بڑی سطروں میں لکھئے۔ ضروری
نہیں ہے کہ اسمیں تسلسل ہو یا قافیہ اور ردیف
کی پابندی کیجائے۔ دماغ پر زیادہ بار نہ
ڈالئے۔ جو چیز سطر کے سامنے آئے بے
کم و کاست بیان کردیجئے اور یہہ تبلانے
کے لئے کہ واقعی آپ شاعری ہی کررہے
ہیں اُن چھوٹی بڑی سطروں کو اس طرح
لکھئے کہ اگر کبھی پڑھنے کا موقع آجائے یعنی
محفل میں سنانے کا موقع آجائے۔ تو
کبھی نہ کسی آواز سے اسے ترنم میں پڑھا
جاسکے۔ طبلہ کی تال کی ضرورت نہیں
ہے۔ بس پڑھا جاسکے۔ ایسا ہو کہ پڑھتے
وقت بعض بعض مقامات پر ہم سانس
لینے کیلئے رک سکیں۔ عروض سائل پر
فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے
عنوانات پسند کیجئے جو عام فہم ہوں سیدھے
سادے ہوں۔ مثلاً "ڈاک خانہ"۔
کوا۔ "مہترانی"۔ صابن دانی "غسلخانہ"
"سڑکیں" وغیرہ وغیرہ۔ ہاں اس بات کا
ضرور خیال رکھئے کہ آپ کی ہر نظم میں ان
الفاظ میں سے کم از کم ۶۔ یا۔ ۷
ضرور رہوں۔ (انگلیوں پر گننے لگتا ہے)
"بیوہ کا شباب" "کتے"۔ "گدھ"
"کفن" "خون"۔ "شب تاریک" "جبلت"
"فاقہ" "بھوک"۔ "ناداری"۔ اور نجاست
و غلاظت کے جتنے الفاظ ہوں وہ سب
آپ کے نوک زبان ہونے چاہئیں۔
(تھوڑی دیر کیلئے رکتا ہے اور سگریٹ جلا
کر پھر کہنے لگتا ہے)

دوم   " ہاں اور ایک بات یہہ ہے کہ خدا۔
رسولؐ۔ ایشور۔ عیسیٰ۔ موسیٰ جتنے
اور پیغمبر ہیں سبکو اپنی ہر نظم میں ایک نہ
ایک گالی۔ مگر ذرا ہیٹ پھیر کی ضرور
دیجئے۔ اس سے کبھی نہ چوکیئے گا۔

سوم   (ہنسکر میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے) آپ

دیکھینگے کہ آپ کی توقع سے زیادہ میں اپنا فرض بجا لاؤنگا۔

درویش دوم کچھ دیر کیلئے رکتا ہے۔ ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگاتا ہے اور ڈبیہ سوم کی طرف کرتے ہوئے پھر کہنا شروع کرتا ہے۔

دوم (چہارم سے مخاطب ہوکر) اب باقی رہے آپ... تو آپ "قوم کے غم میں ڈنر کھائیے حکام کیساتھ" آپ کو مزدوروں کا نبی بنایا جاتا ہے۔ آپ کا کام یہ ہوگا کہ آپ مزدوروں کے بڑے بڑے عظیم الشان جلسے منعقد کیجئے اور ان میں بے معنی دھواں دھار تقریریں کیجئے۔ ہر ۶-۷ جملوں کے بعد "انقلاب" "روٹی - سرمایہ دار" "افلاس" کے الفاظ بہت زور دیکر اور چیخ کر کہئے۔ چندہ خوب زوروں پر جمع کیجئے اور ایک خاص مقام پر محفوظ رکھدیجئے۔ ہر مہینہ بٹوارہ ہوگا۔ ہندوستان کی گلی گلی میں ہتھوڑے اور کھرپہ کے جھنڈے لہرادیجئے۔ حکومت سے ٹکر صرف ایک مرتبہ لیجئے تاکہ وہ آپ کو کچھ دنوں کے لئے جیل میں آرام سے رکھے۔ جب آپ رہا ہونگے تو ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر متصور ہونگے۔ آپ کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مزدور کیا کماتا ہے۔ کیا کھاتا ہے۔ اور کیا کرتا ہے۔ بس آپ صرف یہ چیخے جائیے ہم مساوات چاہتے ہیں۔ مساوات - مساوات اس دوران میں آپ مزدوروں کی باگیں ہماری اُمت کے کوٹھوں کی طرف ضرور موڑ دیجئے صاحب انکو روٹی بتائیے اور خود کھائیے (تھوڑی دیر کیلئے رکتا ہے اور سگریٹ کا ایک کش لیکر پھر کہنے لگتا ہے)

دوم "اور ہاں - درویش سوم آپ کے مخدوم بنکر بہت ہی پرجوش نظمیں آپکے مزدوروں کو فیض پہنچانے کیلئے جلسوں میں بھیجا کرینگے اُن نظموں میں "تاثیر ہی کچھ ایسی ہوگی کہ ہر شخص کچھ عجیب "جذبی کیفیات سے سرشار ہوکر آپ کے قدموں میں اپنے آپ کو ڈالنا عین سعادت سمجھیگا اور اس کے بعد آپ "عصمت" و عفت کے حدود سے باہر ہوجائینگے۔

چہارم "جی بہت خوب - انقلاب" ایسا ہی ہوگا آپ دیکھینگے کہ میں اپنا فرض کس اخلاص کتنی حسن خوبی سے سرانجام دیتا ہوں

(باقی)

چیانگ کائی شک

چین کے موجودہ سیاسی راہنما جنرل چیانگ کائی شک کی زندگی کے تفصیلی حالات [illegible] ملک کے [illegible]
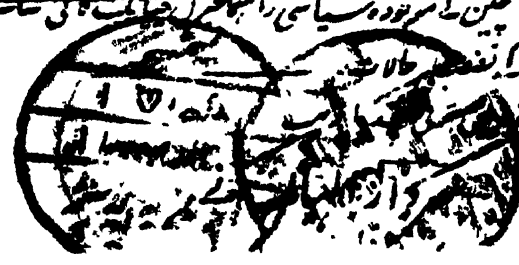
انتہائی کاوش سے مرتب کیا ہے۔
یہ کتاب اردو زبان میں پہلی بار چھپ رہی ہے۔
بہترین کاغذ۔ دیدہ زیب گرد پوش۔
(قیمت ۱۲ ...)

ناشر
ہندستان پبلشنگ کمپنی حیدر آباد دکن رجسٹرڈ

"[illegible] و شہود"

تصور ابن بدیع کی بلند پایہ روح پرور نظموں کا قابل قدر مجموعہ۔
کالی کوری جلد۔ رنگین گرد پوش۔
قیمت چار روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر
ادارۂ اردو حیدر آباد دکن (رجسٹرڈ)
سول ایجنٹ۔
شاپنگ سنٹر پبلک گارڈن روڈ حیدر آباد دکن

مستقل تشہیر کیلئے اس کا انتخاب فائدہ مند ہے ——

دی حیدرآباد ٹریڈ ڈائرکٹری ۱۹۴۵ء

جو کئی سال سے متواتر اپنے وقت پر شائع ہو رہی ہے اور ہندوستان کے ہر حصے میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ تجارتی مقاصد کے لئے یہ ڈائرکٹری یقیناً نفع بخش رہے گی۔

تفصیل کیلئے

مینجر دی حیدرآباد ٹریڈ ڈائرکٹری۔
بنسی لال بلڈنگ سکندرآباد (کو لکھئے)

"تصویر تصور"

ملک کے نوجوان شاعر فطرت تصور ابن بدیع کی کیف آور۔ روح میں تڑپ پیدا کرنے والی غزلوں کا مرکب۔
کالی کوری جلد۔ جاذب نظر گرد پوش۔
(قیمت دو روپیہ آٹھ آنے)
کتب فروشوں کو خاص رعایت دی جائے گی۔
ناشر ادارۂ اردو حیدرآباد دکن (رجسٹرڈ)
سول ایجنٹ شاپنگ سنٹر پبلک گارڈن روڈ حیدر آباد دکن

باہتمام نکلیلجی ایم۔ خان —— محمودیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ارم آصف آباد سے شائع ہو